Title - HAYAAT HAFIZ.

Creator - Aslam Jairajpuri.

Publisher - Matba Faiz Aam (Aligarh).

Date - 1339 H.

Pages - 96.

Subject - Hafiz Sheerazi - Sawaneh -o- Tanqeed; Tazkira Shoray Farsi - Hafiz Sheerazi; Farsi Shayari - Hafiz - Sawaneh.

۷۸۶

حیاتِ حافظ
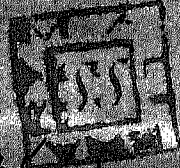
جس میں

خواجہ حافظ شیرازی کے زندگی کے حالات ہیں اور ان کی شاعری پر

مفصل تبصرہ لکھا گیا ہے

مصنفہ

حافظ محمد اسلم ۔ جے راجپوری

باہتمام حافظ محمد عبد اللطیف پرنٹر

۱۳۳۹ھ

مطبع فیض عام علی گڑھ میں طبع ہوئی

مصنف نے علیگڑھ کالج سے شائع کی

بار سوم ۵۰۰ جلد

فہرست مضامین حیاتِ حافظ

لق و دق صحرا میں قدم رکھنے سے جی ڈرتا تھا۔ دوسری طرف رخ کیا۔ اتفاقاً سامنے ہی ایک پُر فضا باغ نظر پڑا یہ خواجہ حافظ شیرازی کی شاعری کا باغ تھا۔ اس کی رنگینی اور لطافت نہایت دلفریب اور دلکش معلوم ہوئی۔ اور جذبۂ شوق بیساختہ اسکی طرف کھینچ لے گیا۔ اب بجائے اس کے کہ کعبہ کا مسافر عرب کی صحرا نوردی کرتا شیراز کے گل گشت مصلے اور آب رکنا باد کی تفریح میں مشغول ہو گیا۔ خوش قسمتی سے حافظ جیسا زندہ دل اور پیرمایہ میزبان ملا جس کی غزل کی دو آتشہ شراب کے جام پیالے پینے شروع کیے اور مزے لیکر یہ کہنے لگا ؎

بدہ ساقی مے باقی کہ در جنت نخواہی یافت
کنار آب رکنا باد و گل گشت مصلے را

ہر چند کہ میرے دوستوں نے میری اس بے تکلفی کو تعجب سے دیکھا۔ اور "لبیک" کے نعرہ کے بجائے میرے لبوں سے "ہات الصبوح" کا شور سنکر مجھے ملامت کرنے لگے لیکن ان دلچسپیوں میں میں کچھ ایسا محو ہو گیا تھا کہ ان باتوں کی مجھے کچھ پرواہ نہیں ہوتی تھی اگر کچھ خیال بھی ہوتا تھا تو دل کہتا تھا ؎

شیوۂ رندی نہ لائق بود اما ایں زماں
چوں در افتادم چرا اندیشۂ دیگر کنم

آخر تین دن کے بجائے تین مہینے اس مہربان میزبان کے باغ میں نہایت لطف کے ساتھ گذارے اسی اثنا میں دوستوں کے لیے بھی اس میں سے ایک گلدستہ تیار کیا جس کو اس ناچیز تصنیف کی شکل میں پیش کرتا ہوں ۔ ع

گر قبول افتد زہے عز و شرف

اسلم - جے راج پوری
مدرستہ العلوم - علیگڈھ

مورخہ ۳۰ر اپریل سنہ ۱۹۰۹ء

تمہید

گذشتہ زمانہ میں جس شخص کو کسی ایسی چیز میں کمال حاصل ہوتا تھا جس سے عوام کو بھی دلچسپی ہو تو اس کے متعلق طرح طرح کی عجیب و غریب روایتیں گھڑی جاتی تھیں جو اس کے تذکرہ کو دلچسپ بنانے کے لیے ہر ایک محفل میں بطور نقل مجلس کے استعمال کی جاتی تھیں۔

اس میں کچھ ایشیا ہی کی خصوصیت نہیں تھی بلکہ اہل یورپ کا بھی یہی حال تھا۔ ہومر کی ایلیڈ اور اوڈیسی جب بہت مقبول ہوئیں تو اس کی طرف ایسی ایسی روایتیں منسوب کی گئیں۔ جن کو دیکھکر بعض مورخوں نے یہ کہا کہ ہومر کوئی شخص ہی نہیں گزرا اور یہ نام فرضی ہے۔

اسی طرح کے لیلی و مجنوں کے عشق کے قصے ہیں۔ جس نے محبت کا کوئی دلچسپ لطیفہ سوچا۔ انھیں کی طرف منسوب کر دیا۔ ہندوستان میں خسرو اور بیربل ظرافت کے لیے نامزد ہو گئے ہیں۔ عوام نے ہزارہا لطیفے ان کے نام سے گھڑ لیے ہیں۔

خواجہ حافظ جن کی غزل شاعرانہ کمال کی آخری حد اور انسانی طبیعت کے لیے ایک لطیف روحانی غذا ہے۔ اس کلیہ سے کیونکر مستثنیٰ رہ سکتے تھے۔ ابتدا ہی سے ان کی شاعری انسانی فطرت سے بالاتر سمجھی گئی کسی نے ان کو خضر کا شاگرد بتایا۔ کسی نے ملہم سمجھا۔ کسی نے مجذوب صوفی کہا۔ کسی نے رند مے پرست اور عاشق مزاج ٹھہرایا۔ اور اسی قسم کی طرح طرح کی روایتیں ان کی طرف منسوب کی گئیں۔ یہی مجلسوں میں

میں بیان ہونے لگیں۔ اور کتابوں میں لکھی جانے لگیں۔ ان طلسمی حکایتوں کے مقابل میں ان کی زندگی کے اصل حالات اور واقعات کی طرف کسی نے بھی توجہ نہیں کی۔ اور زمانہ کی موجیں اپنے ساتھ ساتھ ان کو لیتی گئیں۔

خواجہ کے اندر دو قسم کے کمال تھے یعنی ایک تو وہ نہایت برزگ صوفی تھے۔ دوسرے بہت بڑے شاعر۔ ان دونوں حیثیتوں سے بہت کچھ ان کے متعلق لکھا جانا چاہیے تھا۔ ہم نے جس وقت ان کا تذکرہ لکھنے کا ارادہ کیا تو شعرا کے تذکرے دیکھے صوفیہ اور مشائخ کے حالات پڑھے بہت سی تاریخ کی کتابوں کا مطالعہ کیا مگر سوائے تھوڑے سے حالات اور چند خرافات حکایتوں کے اور کچھ نہ ملا۔

فارسی کی معمولی کتابیں جن میں خواجہ کے کچھ حالات مل سکے یہ ہیں۔

نفحات الانس۔ تذکرہ دولت شاہ سمرقندی۔ سفینۃ الاولیا۔ آتشکدہ۔ خزانۂ عامرہ۔ روضۃ الصفا۔ حبیب السیر۔ مفتاح التواریخ وغیرہ۔

تاریخ فرشتہ اور تاریخ نادری۔ میں بھی کہیں کہیں بعض بعض قصے ضمناً آگئے ہیں انگریزی میں جو تصنیفات فارسی ادب یا خود خواجہ کے متعلق ہوئی ہیں ان میں سے بھی اکثر کتابیں ہم نے دیکھیں مثلاً مسٹر براؤن کی لٹریری ہسٹری آف پرشیا لوئسا کی "روز گارڈن آف پرشیا" انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا۔ گور اوسلی کے بایو گرافیکل نوٹس آن پرشین پوئٹس، کپتان کلارک کا دیوان حافظ کا ترجمہ ولیم جونس کا ترجمہ بکنل کا ترجمۂ انتخاب۔ مگر ان میں بھی وہی قصے اور وہی روائتیں کسیقدر زیادہ آب و تاب کے ساتھ مندرج ہیں۔ اسی زمانہ میں ہم نے سُنا۔ کہ ڈاکٹر گاتھیل نے جو امریکا کی کولمبیا یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں" دی ورلڈس گریٹ کلاسکس" کے سلسلہ میں فارسی ادب پر ایک

بسوط کتاب لکھی ہی۔ بڑی جستجو سے اس کو حاصل کیا اور خواجہ کے حالات پڑھنے شروع کیے مگر ہم کو بھی امتیاز کرنا مشکل ہو گیا کہ آیا یہ کتاب جس کو ہم پڑھ رہے ہیں کوئی تاریخ ہی یا ناول ہی۔

اسی اثنا میں ہم کو ایک گنج مخفی کا پتہ لگا یعنی دہلی کے نواب احمد سعید خانصاحب نے مدرستہ العلوم علیگڈھ کو بہت سی کتابیں دی ہیں جو کتبخانہ سے الگ محفوظ رکھی ہوئی ہیں ان میں سے سینکڑوں کتابیں جو زیادہ تر قلمی اور پرانے زمانہ کی لکھی ہوئی ہیں فارسی ادب اور تاریخ کے متعلق ہیں ہم نے اس بیش بہا ذخیرہ کو بھی چھان ڈالا۔ کئی ایک نئے تذکرے اور نئی تاریخیں ملیں۔ لیکن اُن معلومات میں جو خواجہ کے متعلق ہم کو پہلے سے حاصل تھیں کوئی قابل قدر اضافہ نہیں ہوا۔

ان تذکروں میں سے ایک تذکرہ خاص طور پر ذکر کے قابل ہی۔ اس کا نام ہی تذکرۂ **پنڈت خوشگو** افسوس ہی کہ شروع اور آخر کے بہت سے ورق نہیں ہیں اس وجہ سے اس لائق پنڈت کا نام نہیں معلوم ہو سکا۔

اس پر سنہ ۱۸۶۳ء کی ایک یادداشت لکھی ہوئی ہی کہ گنجے **نور علی** تنباکو فروش سے ۱۵؍ میں خرید کیا گیا۔ میرا خیال ہی کہ اسی تنباکو فروش نے اس کے بیش قیمت ورقے پڑیوں میں صرف کئے ہونگے۔

تمام تذکرہ کے دیکھنے سے یہ معلوم ہوا کہ پنڈت کا تخلص عشقی ہی اور وہ پٹنہ کا رہنے والا ہی زندہ دل پنڈت اپنے آپ کو خواجہ کا روحانی شاگرد سمجھتا ہی اس نے کسی شاعر کا حال چار سطروں سے زیادہ میں نہیں لکھا ہی لیکن خواجہ کے حالات ایک جزو پر بھی تمام نہیں ہوئے وہ خواجہ کا نہایت عقیدت مند ہی اور یہ عقیدت مندی اس کو بطور میراث

سے ملی ہے اس نے لکھا ہے کہ میرے دادا جو جہاں زیب بانو بیگم بنت شاہزادہ دارا شکوہ کی سرکار میں ملازم تھے۔ ہر وقت دیوان حافظ بغل میں رکھتے تھے۔ اور میرے باپ جو اجمیر میں شاہی توپ خانے کے افسر تھے ہر شب جمعہ کو خواجہ کی نذر میں مسکینوں اور غریبوں کو کھانا کھلاتے تھے۔

الغرض جہاں تک ہمارے امکان میں تھا ہم نے جستجو میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا مگر پھر بھی ایسے معتدبہ حالات نہیں معلوم ہوسکے جو خواجہ کے مستقل تذکرہ لکھنے کی ہمت دلاتے ابتدا ہی میں جب ہم نے اس کتاب کے لکھنے کا ارادہ کیا تھا ہمارے ایک معزز دوست نے اُردو کے موجودہ مصنفوں میں سے ایک ممتاز مصنف کا نام لیا کہ وہ بھی خواجہ کا تذکرہ لکھنا چاہتے تھے۔ مگر اسی وجہ سے نہیں لکھا کہ کچھ حالات نہیں مل سکے۔ اس وقت تو ہم نے یہ جواب دیا تھا ؎

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے یکساں جواب　　　آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی

مگر حقیقت میں یہ سیر آسان نہیں ہے ؏　　که عشق آسان نمود اول ولے افتاد مشکلہا

مگر چونکہ خواجہ کے ساتھ دن بدن دنیا کو زیادہ ذوق ہوتا جاتا ہے۔ اسلیے جو کچھ بھی حالات مل سکے تھے دل نے اُن کو چھوڑنا گوارا نہ کیا۔ اور گو ان کی زندگی کا کوئی بڑا کارنامہ یا کوئی مفصل کیفیت نہیں معلوم ہوئی لیکن پھول نہیں تو پنکھڑی ہی سہی انہیں کو غنیمت سمجھکر مرتب کر لیا۔ اور ناظرین کی خدمت میں پیش کرنیکی جرأت کی اُمید ہے کہ احباب اس میں ہمارا زیادہ قصور نہ سمجھیں گے۔ کیونکہ ہم تو گذشتہ مورخین کے پابند ہیں جو حالات ان کی کتابوں میں ہم کو ملیں گے وہی ہم آپ کی خدمت میں پیش کر سکینگے۔ ہمارا تو یہ حال ہے ؎

دریں آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند　　　آنچہ استاد ازل گفت ہماں میگویم

نام و نسب اور تعلیم

خواجہ کا لقب شمس الدین نام محمد اور تخلص حافظ ہے۔

ان کے آبا و اجداد مقام سرکان کے باشندے تھے جو شہر نہاوند کے قریب ہے۔ ان کے دادا شیراز میں آ گئے تھے اور وہیں سکونت اختیار کر لی تھی۔

کسی تذکرہ سے یہ نہیں معلوم ہوا کہ ان کا کیا نام تھا۔ البتہ اتنا پتہ لگتا ہے کہ وہ بڑے نیک تھے تجارت ان کا پیشہ تھا اور شیراز میں ان کی عزت اور وقعت تھی۔

خواجہ کے والد کا نام مولانا کمال الدین تھا جو علما اور اہل کمال میں سے شمار کیے جاتے تھے اور اپنی آبائی تجارت کی وجہ سے دولتمند تھے۔

خواجہ کے ایک چچا بھی تھے جن کا نام سعدی تھا (یہ شیخ سعدی گلستان و بوستاں کے مصنف نہیں ہیں) وہ ایک صوفی منش شاعر اور بڑے باکمال تھے۔

اس سے زیادہ خواجہ کے خاندانی حالات نہیں معلوم ہو سکے لیکن یہ تمام مورخ لکھتے ہیں کہ ان کا گھرانا علم و فضل اور خاندانی وجاہت کے لحاظ سے شیراز میں معزز خیال کیا جاتا تھا۔

خواجہ کی پیدائش شیراز میں ہوئی۔ سنہ ولادت کا ٹھیک پتہ کسی تاریخ سے نہیں چلتا مگر یہ بات مسلم ہے کہ وہ آٹھویں صدی ہجری کی ابتدا میں پیدا ہوئے۔

ان کی زندگی کے حالات پر نظر ڈالتے ہوئے یہ تخمینہ کیا جا سکتا ہے کہ ان کی ولادت ۷۱۵ھ میں ہوئی ہو گی۔ کیونکہ جس وقت وہ تعلیم سے فارغ ہوئے اور شیراز میں ان کی علمی لیاقت کا شہرہ ہوا تو حاجی قوام الدین حسن وزیر نے ایک مدرسہ خاص انہیں کے لیے قائم کیا تا کہ

اس میں وہ طلبا کو فقہ و تفسیر پڑھائیں۔ یہ مدرسہ سنہ ۷۴۵ھ میں قائم ہوا تھا۔ اس لیے یہ قیاس کیا جا سکتا ہی کہ ایسی لیاقت اور شہرت پیدا کرنے کے لیے جو ایک مدرسہ قائم کرنے کی سفارش کرے کم سے کم تیس سال کی عمر ہونی چاہیے۔

خواجہ چونکہ ایک ایسے خاندان میں پیدا ہوئے تھے جس میں علم و فضل موجود تھا۔ اسلیے بچپن ہی سے تحصیل علم میں لگائے گئے پہلے اُنھوں نے قرآن حفظ کیا اور اسی وقت سے حافظ کہے جانے لگے یہ لقب ان کو اتنا پسند آیا کہ یہی اُنھوں نے اپنا تخلص بھی رکھا۔

بعض لوگوں کا خیال ہی کہ خواجہ کا محض تخلص ہی حافظ تھا۔ اور وہ درحقیقت حافظ قرآن نہ تھے مگر ہم کو اس خیال پر تعجب آتا ہی۔ ہر زمانہ میں لاکھوں مسلمان بچے قرآن حفظ کرتے ہیں۔ خواجہ کے حفظ قرآن سے انکار کرنے کی کیا وجہ ہی۔ علاوہ بریں اس زمانہ میں شیراز ایک ایسا مقام تھا جہاں تمام اسلامی دنیا سے زیادہ قرآن خوانی کا چرچا تھا۔ ابن بطوطہ آٹھویں صدی ہجری کا مشہور سیاح جو حافظ ہی کے زمانہ میں پہلی بار سنہ ۷۲۷ھ اور دوسری بار سنہ ۷۴۸ھ میں شیراز میں گیا ہی۔ اپنے سفرنامہ میں لکھتا ہی کہ "جس ذوق و شوق اور خوش الحانی کے ساتھ شیراز کے لوگ قرآن پڑھتے ہیں ایسا تمام دنیا میں کہیں میں نے نہیں سُنا" اس عام ذوق شوق کا یہ لازمی نتیجہ ہوگا کہ وہاں کے بچوں کو زیادہ تر قرآن حفظ کرایا جاتا ہوگا۔ ایسی حالت میں حافظ جو ایک علم پرست خاندان کے بچے تھے کیونکر اس سے محروم رہتے خود اُن کے دیوان میں جا بجا بہت سے ایسے اشعار موجود ہیں جن سے ان کے حافظ قرآن ہونے کا ثبوت ملتا ہی مثلاً ایک غزل میں لکھتے ہیں ؎

اے چنگ فرو بردہ بخون دل حافظ   فکرت مگر از غیرت قرآن خدا نیست

ظالم! تونے حافظ کے خون دل میں ہاتھ ڈبو رکھا ہی شاید کلام الٰہی کی عزت کا تجھے کچھ خیال نہیں ہی۔

دوسری غزل میں ایک شعر ہے۔

ندیدم خوشتر از شعر تو حافظ　　بقرآنیکہ اندر سینہ داری

حافظ میں نے تیرے شعروں سے اچھے کبھی شعر نہیں دیکھے اس قران کی قسم ہے جو تیرے سینہ میں ہے۔

یہی نہیں کہ وہ معمولی حافظ تھے بلکہ تمام قراتوں سے بھی واقف تھے اور اپنی قران دانی پر ان کو ناز تھا۔ چنانچہ کہتے ہیں ؎

عشقت رسد بفریاد گر خود بسان حافظ　　قرآن ز بر بخوانی با چاردہ روایت

عشق تیری فریاد رسی کرے اگر تو بھی حافظ کی طرح قران کو چودہوں قراتوں کے ساتھ از بر پڑھے۔

حفظ قران کے بعد خواجہ نے مولانا شمس الدین محمدؐ عبداللہ شیرازی کے حلقہ درس میں جو کہ بڑے مشہور فقیہ اور مفسر تھے اور دور دور سے لوگ ان کے یہاں پڑھنے کے لیے آتے تھے تفسیر اور فقہ پڑھی۔

مولانا شمس الدین محمدؐ حافظ کی ذہانت پر اس قدر فریفتہ تھے کہ ان کو اپنی اولاد سے بھی زیادہ عزیز سمجھتے تھے۔ یہاں تک کہ اُنھوں نے اپنا لقب شمس الدین ان کو عطا کر دیا۔

بعض مورخ لکھتے ہیں کہ خواجہ نے علامہ سید شریف جرجانی متوفی ۸۱۶ھ سے جو کہ تیموری علماء میں سے ہیں منطق کی کتابیں پڑھیں لیکن یہ غلط ہے کیونکہ علامہ سید شریف ۷۴۰ھ میں پیدا ہوے جس کے پانچ ہی سال بعد خواجہ مسند درس پر بیٹھے جو زمانہ خواجہ کے بڑھاپے کا ہے وہ ان کی جوانی کا ہے پھر یہ کیونکر یقین کیا جائے کہ خواجہ نے ان کی شاگردی کی ہوگی۔ خواجہ شروع ہی سے ذہین فطین اور طباع تھے اس وجہ سے علوم عقلیہ مثلاً منطق فلسفہ اور فقہ سے ان کو خاص دلچسپی تھی اور ساتھ ہی علم ادب سے بھی بہت ذوق تھا۔ زیادہ تر شعراء جاہلیت کے دواوین کی جستجو میں رہتے تھے سکاکی کی کتاب مفتاح جو معانی و

بیان میں ہی اکثر اپنے مطالعہ میں رکھتے تھے۔

مگر ان کے تمام علمی ذوق کا مرکز دراصل قرآن تھا کیونکہ علوم قرآنیہ کے ساتھ ان کو شغف تھا اور اکثر وہ تفسیروں کا درس دیا کرتے تھے۔ کشاف۔ جو قرآن کی ایک معرکتہ الآرا تفسیر اور علامہ زمخشری معتزلی کی تصنیف ہے ان کو تمام تفسیروں سے زیادہ مرغوب تھی۔ چنانچہ انہوں نے ایک حاشیہ بھی اس پر عربی زبان میں لکھا ہے اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ معقول و منقول پر بھی حاوی تھے اور معتزلہ کے عقلی مباحث کو دلچسپی کی نظر سے دیکھتے تھے۔

اگرچہ خواجہ کے زمانہ سے تقریباً ایک صدی پہلے تاتاری حملہ نے اسلامی جاہ و جلال کو اپنی خون فشاں موجوں میں غرق کر دیا تھا مگر خدا کی قدرت کے عجیب کرشمے ہوتے ہیں وہی حملہ آور کچھ مدت کے بعد مسلمان ہو گئے جس کی وجہ سے اسلام کی خشک رگوں میں پھر ایک تازہ خون دوڑ گیا۔ اور علوم اسلامیہ کے ٹمٹماتے ہوئے چراغ پھر روشن ہو گئے۔

خواجہ کے زمانہ میں تاتاری خاندان کا آخری بادشاہ ابوسعید خاں بغداد کے تخت پر رونق افروز تھا۔ جو بڑا عادل پرہیزگار اور علم پرست تھا اس کے زمانہ میں شیراز کے مردم خیز خطہ میں جہاں ہمیشہ سے بڑے بڑے علما و فضلا پیدا ہوتے چلے آئے تھے ایک جماعت ایسے اہل کمال کی موجود تھی جن کی نظیر اس صدی میں تمام دنیائے اسلام میں مشکل سے مل سکتی ہے مثلاً قاضی مجدالدین اسمٰعیل۔ قاضی عضد۔ مولانا بہاء الدین وغیرہ جن کی تصنیفات اور کارنامے قیامت تک مقبول اور یادگار رہیں گے۔

خواجہ نے انہیں اہل کمال بزرگوں کی صحبت کا فیض حاصل کیا۔ اسی وجہ سے ان کے اندر علم کا صحیح مذاق پیدا ہو گیا اور ان کی استعداد اور لیاقت کا شہرہ ہونے لگا۔

حاجی قوام الدین حسن نے جو شاہ ابواسحاق والی شیراز کے وزیر اور بڑے علم دوست تھے

خواجہ کی استعداد کو دیکھکر ان کے لیے ایک مدرسہ قائم کیا تاکہ وہ فقہ اور تفسیر کا درس دیں۔

شاعری کی ابتدا

فارس اور خاصکر شیراز میں شاعری کا مذاق عام تھا۔ بادشاہ اور فقیر، عالم اور جاہل، بڈھا اور جوان غرض ہر شخص کچھ نہ کچھ اس کا چسکا رکھتا تھا۔ خواجہ جن کو فطرتاً چلبلی اور شاعرانہ طبیعت ملی تھی اس سے کیونکر الگ رہ سکتے تھے بچپن ہی سے ان کو بھی اسکا شوق دامنگیر ہوا۔

خواجوؔ[1] کرمانی جو نہایت لطیف و ظریف شاعر اور صوفی منش آدمی تھا۔ اُس زمانہ میں شیراز ہی میں تھا خواجہ اکثر اس کی صحبت میں بیٹھتے اور شاعرانہ رموز و نکات اس سے حل کرتے۔

علاوہ بریں خود ان کے چچا سعدی بہت اچھے شاعر تھے اور ان کے جلسوں میں اکثر شعر و شاعری کے تذکرے رہتے تھے۔

بچپن ہی کے زمانہ کا قصہ ہے کہ ان کے چچا سعدی ایک مکان میں بیٹھے ہوئے کوئی صوفیانہ غزل لکھنی چاہتے تھے۔ ابھی اُنھوں نے ایک ہی مصرعہ لکھا تھا کہ کسی ضرورت سے ان کو باہر جانا پڑا۔ کاغذ وہیں چھوڑ گئے۔ خواجہ نے ایک مصرعہ لکھا ہوا دیکھکر اس پر دوسرا مصرعہ لگاکر شعر پورا کر دیا۔ سعدی جب باہر سے آئے تو پورا شعر لکھا ہوا دیکھکر حیرت میں ہوگئے اور خواجہ سے پوچھا کہ تم نے دوسرا مصرعہ لگایا ہے۔ اُنھوں نے کہا ہاں۔ یہ سنکر وہ بہت خوش ہوئے اور کہا اچھا تمہیں اس غزل کو پوری کر دو۔

---

[1] خواجو کرمانی شاہ ابو اسحاق کے عہد میں شیراز میں آیا تھا۔ خواجہ علاء الدولہ سمنانی رح کا مرید ہوا۔ صوفی آباد کی خانقاہ میں جو شیراز میں واقع ہے۔ بہت دنوں تک ریاضت و مجاہدہ کرتا رہا ۷۳۵ھ میں شاہ ابو اسحاق کے بیٹے کا ختنہ تھا۔ اس میں تہنیت نامہ لکھکر پیش کیا۔ شاہ نے اشرفیوں سے بھرا ہوا ایک طبق صلہ میں عطا کیا۔ دیکھتے ہی خوشی سے مرگیا۔ قبر شیراز ہی میں ہے ایک دیوان اور مثنوی یادگار ہے۔

خواجہ نے تھوڑی دیر میں غزل پوری کر دی۔ اور ایسی اچھی کہی کہ سعدی اس کو دیکھکر متحیر ہو گئے اور وجد میں آ گئے۔ پھر خواجہ سے کہا جا! تو ایسا شاعر ہوگا کہ جو تیرے اشعار سُنے گا وہ مجذوب اور مخبوط الحواس ہو جائے گا۔ کپتان کلارک لکھتے ہیں کہ قسطنطنیہ کے ترک اس بات پر عقیدہ رکھتے ہیں کہ سعدی کی دعا کا اثر خواجہ کے کلام میں ہے۔ کہ جو اسکو پڑھتا ہے بیخود اور مجذوب ہو جاتا ہے۔

بعض تذکرہ نویس خواجہ کی شاعری کے متعلق یہ عجیب غریب حکایت لکھتے ہیں کہ شیراز سے چار میل کے فاصلہ پر ایک مقام ہے جس کا نام پیر سبز ہے۔ وہ ایک پہاڑ کے ٹیلے پر واقع ہے جو باباکوہی کے نام سے مشہور ہے فارس میں یہ مشہور تھا کہ جو شخص اس مقام پر ایک چلہ کھینچے حضرت خضرؑ اس کو آب حیات پلا دیتے ہیں اور وہ اعلیٰ درجہ کا شاعر ہو جاتا ہے خواجہ نے بھی اسی ارادہ سے چلہ کشی شروع کی۔ روزانہ رات کے پچھلے پہر وہاں جاتے۔ ورد اور وظیفہ پڑھتے۔ اسی زمانہ میں ان کو ایک بازاری عورت شاخ نبات نامی سے عشق ہو گیا تھا۔ اتفاق سے ایک دن رات کو اس کے کوچہ میں چلے گئے۔ اور وہی چلہ کی چالیسویں رات تھی شاخ نبات کہاں تو کبھی التفات ہی نہیں کرتی تھی اور کہاں آج بڑی لگاوٹ کی باتیں شروع کیں۔ خواجہ بھی اس کی باتوں میں کچھ ایسے محو ہوے کہ چلہ کا خیال ہی دل سے جاتا رہا جب رات زیادہ ہو گئی تو یکایک خیال آیا گھبرا کر اُٹھے۔ اس نے ہر چند روکنے کی کوشش کی لیکن انھوں نے ایک نہ سُنی اور پیر سبز پہونچکر حسب معمول وظیفہ پڑھنا شروع کیا۔ ان کی اس مستعدی پر خدا کو رحم آیا۔ حضرت خضرؑ نمودار ہوے اور اُنھوں نے آب حیات کا پیالہ پلا دیا۔ اسیدن سے ان کو ایک غیر فانی شاعری مل گئی۔ صبح کو حسب حال یہ غزل لکھی۔

دوش وقتِ سحر از غصّہ نجاتم دادند — وندراں ظلمتِ شب آبِ حیاتم دادند

بیخود از شعشعۂ پرتوِ ذاتم کردند — بادہ از جامِ تجلّیِ صفاتم دادند

چہ مبارک سحرے بود و چہ فرخندہ شبے — آں شبِ قدر کہ ایں تازہ براتم دادند

چوں من از عشقِ رخش بیخود و حیراں گشتم — خبر از واقعۂ لات و مناتم دادند

من اگر کامروا گشتم و خوشدل چہ عجب — مستحق بودم و اینہا بزکاتم دادند

بعد ازیں روے من و آئینۂ حسنِ نگار — کہ دراںجا خبر از جلوۂ ذاتم دادند

کیمیائیست عجب بندگیِ پیرِ مغاں — خاکِ او گشتم و چندیں درجاتم دادند

ہاتف آں روز بمن مژدۂ ایں دولت داد — کہ بباز از غمش صبر و ثباتم دادند

ایں ہمہ شہد و شکر کز سخنم میریزد — اجرِ صبریست کزاں شاخِ نباتم دادند

ہمّتِ حافظ و انفاسِ سحرخیزاں بود
کہ ز بندِ غمِ ایام نجاتم دادند

اس غزل کا یہ شعر

ایں ہمہ شہد و شکر کز سخنم میریزد — اجرِ صبریست کزاں شاخِ نباتم دادند

اس واقعہ کی شہادت میں پیش کیا جاتا ہی اور اس کے یہ معنی بیان کیے جاتے ہیں کہ

"یہ تمام شہد و شکر جو میرے کلام سے ٹپکتا ہی اس صبر کا بدلہ ہی جو شاخ نبات کی طرف سے مجکو عطا ہوا۔"

گذشتہ زمانہ کی تواریخ میں اس قسم کے واقعات گو خرافات ہی سہی لیکن ان سے اس شخص کی عظمت ضرور ثابت ہوتی ہی جس کے متعلق یہ بیان کیے جاتے ہیں چنانچہ اس حکایت سے یہ بات صاف معلوم ہوتی ہی کہ خواجہ کی شاعری کو عام طور پر لوگ انسانی فطرت سے بالاتر سمجھتے تھے اس لیے یہ حکایت وضع کی گئی جس میں یہ دکھایا گیا

کہ ان کی شاعری کسبی نہ تھی بلکہ خداداد تھی۔

اصلیت یہ ہی کہ یہ بے نظیر صوفیانہ غزل جیسا کہ خود اس میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہی خواجہ نے اس موقع پر لکھی ہی جب کہ ان کو شرح صدر حاصل ہوا ہی۔ اور ان کا سینہ عرفان کے اسرار سے لبریز کر دیا گیا ہی۔

مذکورہ بالا شعر جو اس حکایت کے ثبوت میں نقل کیا گیا ہی اس کے وہ معنی نہیں جو لوگوں نے سمجھے ہیں۔ شاخ نبات در اصل دادند کا مفعول ہی اور شعر کے صحیح معنی یہ ہیں۔

"یہ تمام شہد و شکر جو میرے کلام سے ٹپکتا ہی اسی صبر کا بدلہ ہی کہ اسکے عوض میں یہ نے شکر (کلک قلم) مجکو خدا نے عطا کیا"

شاخ نبات کے معنی نے شکر کے ہیں جس سے کلک قلم مراد ہی۔

خواجہ نے اپنے دیوان میں جابجا شاخ نبات اپنے قلم ہی کو لکھا ہی ایک جگہ کہتے ہیں۔

کلک حافظ شکریں شاخ نباتیست ببین   کہ دریں باغ نہ بینی ثمرے بہتر ازیں

حافظ کا قلم ایک شیریں نے شکر ہی۔ اس باغ میں اس سے بہتر کوئی اور میوہ تم کو نظر نہ آئے گا"

دوسرا شعر ہی۔

حافظ چہ طرفہ شاخ نباتیست کلک تو   کش میوہ دل پذیر تر از شہد و شکر است

"حافظ تیرا قلم نہایت ہی عمدہ نے شکر ہی کہ جس کا میوہ شہد و شکر سے بھی زیادہ دلپسند ہی"

اصلیت یہ معلوم ہوتی ہی کہ اس قصہ کا گھڑنے والا اس شعر میں شاخ نبات کے معنی سمجھ نہ سکا۔ اس نے فوراً اس کو ایک بازاری معشوقہ کا نام قرار دیکر یہ حکایت چسپت کر دی عوام کی عجائب پرستی نے اس کو اتنا فروغ دیا کہ لغت کی کتابوں میں بھی اب شاخ نبات کے معنی "ایک شیرازی معشوقہ" کے لکھے جانے لگے۔

حالانکہ شاعر کا مطلب یہ ہی کہ میرا قلم مثل ایک نے شکر کے ہی جس سے شہد و شکر یعنی عشق حقیقی کے رموز اور معرفت کے اسرار بھرے ہوئے شیریں اشعار اس طرح ٹپکتے ہیں جس طرح شاخ سے میٹھے پھل ٹپکتے ہوں اور یہ عشق الٰہی میں صبر کرنے کا اجر ہی جو خدا نے مجھکو عطا فرمایا ہی۔

خواجہ گو بہت بڑے عالم۔ فقیہ صالح اور زاہد تھے اور ان کا تمام وقت علمی مشغلوں اور عبادت و ریاضت میں صرف ہوتا تھا مگر باوجود اس کے اُن کی طبیعت میں فطرت نے بے نظیر شاعرانہ طاقت ودیعت رکھی تھی اس لیے وہ نچلا نہیں بیٹھنے دیتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اس زمانہ میں شاعرانہ مذاق فارس کی آب ہوا میں رچا ہوا تھا۔ خاصکر شیراز میں جہاں کہ تھوڑی مدت پہلے شیخ سعدی علیہ الرحمۃ نے اپنی بے مثل غزلوں سے جو عشق حقیقی اور عشق مجازی دونوں کا پہلو لیے ہوئے تھیں شاعری کا ایک نیا باب کھولکر طبیعتوں کو اور اُکسا دیا تھا۔ اور عام ولولہ اور جوش لوگوں کے دلوں میں پیدا کر دیا تھا۔ بہت سے لوگ جو اپنی ثقاہت اور متانت کی وجہ سے اب تک شاعری سے پرہیز کرتے تھے ان کے سر بھی شیخ کی غزلوں کے سامنے جُھک گئے۔ بڑے بڑے زاہد۔ عابد اور اہل دل بھی اس میں عشق حقیقی کا چٹخارا دیکھکر اس پر ٹوٹ پڑے اور شاعری بلا تکلف ان محفلو میں بھی بار پا گئی جہاں اب تک اس کی رسائی نہیں ہوسکی تھی علماء اور صلحاء بھی بطور تفنن کے شاعری میں طبع آزمائی کرنے لگے۔ اس لیے باایں علم و زہد و صلاح و تقویٰ خواجہ کا شاعری کی طرف توجہ کرنا جو اُن کے مرتبے کے لحاظ سے بہت ادنیٰ اور پست تھی عام لحاظ سے کوئی ننگ و عار کی بات نہ تھی۔ چنانچہ اُنھوں نے بھی وہی شیخ کی روش اختیار کی۔ اور عشق مجازی کے جام سفالین میں عشق حقیقی کی شراب پلانی شروع

کی جوان سے پہلے شیخ پلا گیا تھا۔ مگر یہ اس قدر تند اور تیز تھی کہ ہر طبقہ اور ہر درجہ کے لوگ اس سے ایسے بیخود ہوئے کہ ان کو پھر کسی کی خبر نہ ہوئی۔ مقدس محفلوں خانقاہوں امراء اور وزراء کی مجلسوں بازاروں اور شاہراہوں میں غرض ہر جگہ اسی مئے دو آتشہ کا دور چلنے لگا اور چاروں طرف حافظ شیرازی کی غزل کا نغمہ گونج اٹھا ؎

فگند زمزمۂ شوق در عراق و حجاز نوائے بانگِ غزلہائے حافظ شیراز

خواجہ کی شاعری تصنّع اور بناوٹ سے پاک ہے وہ اُن شعراء کی طرح نہیں تھے جن کا پیشہ شاعری ہو۔ نہ وہ مصنوعی جذبہ پیدا کرتے تھے بلکہ ان کی شاعری تفنن طبع کے طور پر تھی۔ اور وہ درویشانہ اور عالمانہ زندگی رکھتے تھے جب کوئی موقع ایسا آجاتا تھا کہ ان کی شاعری کے جذبہ کو تحریک ہو تو وہ بے ساختہ غزل کہدیتے تھے۔ ان کی ایک ایک غزل ایک ایک تاریخی واقعہ اپنے ساتھ رکھتی ہے کسی میں وہ کسی دوست کی وفات پر روتے ہیں۔ کسی میں کسی کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ شاہی دربار کا ذکر ہے تو غزل میں خانقاہ کے حلقہ کا ذکر ہے تو غزل میں غزل ہی میں مدح کرتے ہیں اور غزل ہی میں مرثیے لکھتے ہیں۔

الغرض سوائے غزل کے جو طبیعت کے اصلی اپج سے ہوتی ہے قصیدہ وغیرہ جنمیں مصنوعی خیالات ہوتے ہیں اُنھوں نے کبھی نہیں کہا دولت شاہ سمرقندی لکھتا ہے "او را باصناف سخنوری التفاتے نیست الا بغزلیات" یعنی حافظ سوائے غزل کے اور اصناف شاعری کی طرف توجہ نہیں رکھتے تھے۔ لطف علیخاں آتشکدہ میں لکھتا ہے "از فنون شعر میل کلی بغزل سرائی داشت" یعنی ان کی ساری توجہ غزل گوئی ہی کی طرف تھی۔ جہاں کوئی لطیف شاعرانہ بات نظر پڑگئی اس پر غزل لکھدی۔

ایک دفعہ حاجی قوام الدین کے یہاں دعوت تھی گرمی کا موسم تھا پائیں باغ میں تخت بچھا ہوا تھا اُس پر کھانا کھا رہے تھے۔ پانی کے کٹورہ میں نیلے آسمان اور تیسری یا چوتھی رات کے چاند کا عکس نظر پڑا اُس وقت یہ منظر بہت دلفریب معلوم ہوا اور فوراً یہ شعر موزوں کیا۔ ؎

دریائے اخضر فلک و کشتیٔ ہلال   ہستند غرق نعمت حاجی قوام ما

اس مناسب موقع شعر کو سُنکر لوگ پھڑک اُٹھے اسی پر غزل پوری کی۔ شاعرانہ تخیل کی رفتار دیکھئے کہاں سے کہاں پہنچتے ہیں!! ؎

ما در پیالہ عکسِ رخ یار دیدہ ایم   اے بیخبر زلذتِ شربِ مدامِ ما

بڑی بڑی لاجواب غزلیں بے تکلف تھوڑی دیر میں کہدیتے تھے سلطان غیاث الدین والی بنگالہ نے جس کا قصہ آگے آئیگا۔ جب ان کی طلبی کے لیے اپنے خاص غلام یاقوت کو شیراز بھیجا تو رات کو جس وقت سلطان کا خط ملا اسی وقت اُنھوں نے سلطان کے لیے ایک بے مثل غزل لکھکر دیدی۔ چنانچہ اسی میں کا یہ شعر ہے ؎

طے مکاں ببین و زمانِ سلوک شعر   کیں طفل یکشبہ رہ یکسالہ میرود

شعر کی رفتار کا زمانہ اور اتنی بڑی مسافت کا طے کرنا دیکھو۔ کہ یہ ایک رات کا بچہ ایک سال کی راستہ کی مسافت پر جاتا ہے!

امراء اور سلاطین کا دربار

خواجہ کی تمام زندگی کا زمانہ فارس اور خاصکر شیراز کے لیے ایک نہایت پر آشوب زمانہ تھا۔ اس عہد میں بڑے بڑے عظیم الشان انقلابات واقع ہوئے۔ خواجہ کی ۷۵-۷۶ سال کی زندگی میں شیراز میں سات بادشاہ ہوئے۔ اور اکثر اُن میں باہم

سخت خونریز لڑائیاں ہوئیں۔ سلطان مظفر کے بیٹے ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ خانہ جنگی ہی میں مصروف رہے اور اسی میں اُنھوں نے سلطنت ہی کھو دی۔ سب سے آخر میں تیموری حملہ شیراز پر ہوا جو ایک قیامت کا نمونہ تھا۔

ان بیدردیوں اور ہولناک خونریزیوں کو اُنھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا انقلابات زمانہ کے بڑے بڑے منظر اُن کی نگاہ سے گذرے۔ اُنھوں نے دیکھا کہ آج دنیا جس سر پر تاج رکھتی ہے کل اسی کو خاک و خون میں پامال کر ڈالتی ہے۔ اسی وجہ سے اس کے چند روزہ جاہ و جلال سے سخت نفرت ہو گئی۔ اور اُنھوں نے کنج خلوت میں اطمینان کے ساتھ ایک گھڑی گذار دینے کو تمام دنیا کی بادشاہی پر جس میں ہزاروں جھگڑے ہوتے ہیں ترجیح دی۔ اور پکار اُٹھے ؎

بفراغ دل زمانے نظرے بماہ روئے   بہ از آنکہ چتر شاہی ہمہ عمر و ہائے ہوئے

اطمینان کے ساتھ کسی حسین کو ایک وقت ایک نظر دیکھنا اس سے بہتر ہے کہ تمام عمر سر پر چتر شاہی ہو اور سیکڑوں بکھیڑے ہوں

خواجہ نے ہر چند ان ناگوار حادثات کا اثر جن سے یقیناً وہ متاثر ہوئے ہوں گے اپنے کلام میں نہیں آنے دیا۔ اور اپنی اصلی شاعرانہ خوشی سے آب حیات میں اس زہر کے چھینٹے نہیں پڑنے دیئے۔ لیکن آخر انسان تھے۔ کہاں تک ضبط کرتے ایک غزل میں رو ہی پڑے ؎

این چہ شوریست کہ در دور قمر مے بینم   ہمہ آفاق پر از فتنہ و شر مے بینم

ہر کسے روز بہی میطلبد زین ایام   مشکل آنست کہ ہر روز بتر مے بینم

ابلہاں را ہمہ شربت ز گلاب و قند است   قوت دانا ہمہ از خون جگر مے بینم

اسپ تازی شدہ مجروح بزیر پالاں   طوق زرین ہمہ در گردن خر مے بینم

دختراں را ہمہ جنگست و جدل با مادر   پسراں را ہمہ بدخواہ پدر مے بینم

ہیچ رحمے نہ برادر بہ برادر دارد　　ہیچ شفقت نہ پدر را بہ پسر مے بینم

پند حافظ بشنو خواجہ برو نیکی کن

کہ من این پند بہ از در و گہر مے بینم

خواجہ ایک نہایت ملنسار اور خوش خلق انسان تھے۔ امیر و غریب ادنیٰ و اعلیٰ سب سے ملتے تھے۔ اور ہر طبقہ میں وہ ہر دلعزیز تھے۔ فقیروں کے حلقہ کے چراغ تھے اور بادشاہوں کے بزم کی شمع۔ وہ ان تمام شاہان شیراز کے دربار میں آمد و رفت رکھتے تھے۔ مگر درباروں میں اُن کا اعزاز ایک مقدس بزرگ و ممتاز عالم کی حیثیت سے تھا نہ کہ شاعر کی حیثیت سے۔ یہی وجہ ہے کہ اُنھوں نے کسی امیر یا وزیر کی شان میں کبھی کوئی قصیدہ نہیں لکھا جو شعراء کا خاصہ خیال کیا جاتا ہے اور جس سے شیخ سعدی جیسے بزرگ تارک الدنیا بھی نہیں بچ سکے۔ اُنھوں نے بہت کیا تو یہ کیا کہ کسی غزل میں ایک دو شعر کسی کی تعریف میں بڑھا دیئے اور اس کا نام لے دیا اور بس۔

ان کے ابتدائی زمانہ میں سلطان ابو سعید خاں بغداد کا بادشاہ تھا تمام عراق و فارس اسکے قبضہ میں تھا۔ اس کے زمانہ میں اس کی طرف سے شیخ حسین پسر امیر الامرا چوپان شیراز کا والی تھا۔ اہل شیراز عام طور پر اس سے ناراض تھے سنہ ۷۳۶ھ میں جب سلطان ابو سعید خاں نے وفات پائی اور بوجہ اس کے کہ اس کے کوئی بیٹا نہ تھا۔ اطراف ممالک میں جس کا جہاں بس چلا اس نے قبضہ کرلیا۔ اور ایک سلطنت کی گیارہ سلطنتیں ہوگئیں۔ تو شیخ حسین اپنی جان کے خوف سے شیراز سے بھاگ گیا۔ شیخ ابو اسحاق نے جو سابق والی شیراز محمد شاہ انجو کا بیٹا تھا موقع پاکر شیراز اور اصفہان پر اپنی مستقل حکومت قائم کرلی۔

ابو اسحاق	شاہ ابو اسحاق کا عہد شیراز والوں کے لیے امن و عیش کا زمانہ تھا۔

ملک میں خوشحالی اور رفاہیت تھی۔ خواجہ اس کے دربار میں آمد و رفت رکھتے تھے۔
اور وہ ان کا بہت قدردان تھا۔

شاہ ابو اسحاق میں اگرچہ تمام خوبیاں تھیں۔ مگر وہ آرام پسند تھا۔ ۷۵۴ھ میں امیر مبارز الدین مظفر[۵۱] نے اس کو غافل پاکر شیراز پر حملہ کر دیا۔

دولت شاہ سمرقندی لکھتا ہے کہ امیر مظفر جب فوج لیکر شیراز کے ارادہ سے چلا تو ابو اسحاق کے وزیروں نے اس سے کہنا شروع کیا کہ اب ہم کو بھی لڑائی کی تیاری کرنا چاہیئے وہ اس بات سے کبیدہ خاطر ہوتا تھا اور اُس نے منع کر دیا تھا کہ اب جو میرے سامنے اس قسم کی بات کہے گا میں اس کو سزا دونگا۔ یہانتک کہ امیر مظفر کی فوجیں شیراز کے گرد آگئیں۔ لیکن کس کی مجال تھی کہ بادشاہ کو خبر کرے۔ آخر امین الدین جہرمی نے جو بادشاہ کا خاص ہمنشیں تھا کہا کہ آجکل بہار کا موسم ہے۔ چاروں طرف میدان اور پہاڑ سرخ و سبز ہو رہے ہیں۔ حضور بالاخانہ پر تشریف لے چلیں اور ملاحظہ فرمائیں۔ جب شاہ بالاخانہ پر آیا تو شہر کے چاروں طرف لشکر کو دیکھا۔ پوچھا یہ کیا ہے۔ ایک وزیر نے کہا کہ مظفر شیراز کو فتح کرنیکے لیے آیا ہے۔ بادشاہ نے کہا کہ عجب احمق ہے جو بہار کے موسم کو اس طرح رائیگاں کھو رہا ہے۔ اور یہ شعر پڑھکر نیچے اُتر آیا ؎

بیا تا یک امشب تماشا کنیم | چو فردا رسد کار فردا کنیم

(آؤ آج کی رات تو مزے میں گزاریں کل کا کام کل دیکھا جائے گا)

[۵۱] امیر مظفر کا باپ محمد شاہ خراسان کا ایک معمولی باشندہ تھا سلطان محمد خدابندہ کے زمانہ میں اس کو کچھ عروج ہو گیا اور وہ شہر مراغہ میں ایک معزز عہدہ پر مقرر کیا گیا وہاں اپنی عقلمندی و شجاعت سے اسنے کارہائے نمایاں انجام دیئے جنکے صلہ میں اسکو امارت کا درجہ عطا ہوا سلطان ابوسعید خاں کے عہد میں اسکا انتقال ہو گیا سلطان نے اسکے بعد مظفر کو امارت عطا فرمائی جب سلطان کے مرنیکے بعد طوائف الملوکی پھیلی تو امیر مظفر نے یزد پر اپنی سلطنت قائم کر لی شاہ ابو اسحاق نے اسکو کمزور پاکر یزد بھی اس سے چھین لیا مگر اس نے ایسی جمعیت فراہم کی کہ ابو اسحاق کو شکست دی اور شیراز سے تبریز تک اپنی حکومت قائم کر لی۔

دولت شاہ کہیں کہیں اس قسم کے قصے بھی لکھ دیتا ہی جو سادہ لوحوں کو دلچسپ معلوم ہوں۔
حقیقت یہ ہی کہ شاہ ابو اسحاق اور مظفر میں ابتدا ہی سے لڑائیاں ہوتی چلی آتی تھیں اور ہمیشہ ابو اسحاق کو فتح ہوتی تھی کیونکہ اس کے پاس فوج بہت زیادہ تھی لیکن اس حملہ میں بازی پلٹ گئی شاہ ابو اسحاق گو بڑی جرأت سے لڑا لیکن امیر مظفر نے اس کو شکست دیدی اور وہ میدان چھوڑ کر اصفہان بھاگا۔ وہاں ۴-۵ سال تک رہا اور پھر امیر مظفر کے حکم سے قتل کر دیا گیا
خواجہ اپنے اس قدردان کے مرنے پر اس غزل میں روتے ہیں ؎

یاد باد آنکہ سر کوے توام منزل بود	دیدہ را روشنی از نور رخت حاصل بود
راست چوں سوسن و گل از اثر صحبت پاک	بر زباں بود مرا آنچہ ترا در دل بود
در دلم بود کہ بے دوست نباشم ہرگز	چہ تواں کرد کہ سعی من و دل باطل بود
راستی خاتم فیروزۂ بو اسحاقی[۱]	خوش درخشید ولے دولت مستعجل بود

دیدی آں قہقہۂ کبک خراماں حافظ
کہ ز سر پنجۂ شاہین قضا غافل بود

حاجی قوام حاجی قوام الدین حسن طمغچی خواجہ کے سب سے پہلے مربی اور خاص سرپرست تھے اُنھوں نے ان کے لیے مدرسہ قائم کیا تھا۔ خواجہ نے بہت سی غزلوں میں حاجی صاحب موصوف کا نام لیا ہی حتی کہ جس غزل میں اُنھوں نے اپنی خیالی زندگی کی تصویر کھینچی ہی اس میں بھی حاجی قوام کو نہیں بھولے ہیں۔ کہتے ہیں۔

عشق بازی و جوانی و شراب لعل فام	مجلس اُنس و حریف ہمدم و شرب مدام
ساقی شکر دہان و مطرب شیریں سخن	ہم نشین نیک کردار و ندیم نیک نام

۱؎ شاہ ابو اسحاق کے نام سے بو اسحاقی فیروزہ کی ایک کان کا نام رکھا گیا تھا۔

شاہدے در لطف و پاکی ہمچو آب زندگی	دلبرے در حسن و خوبی غیرت ماہ تمام
غمزۂ ساقی بیغمائے خرد آہختہ تیغ	زلف جاناں از برائے صید دل گسترده دام
بادہ گلرنگ و تلخ و تیز و خوشخوار و سبک	نقلے از لعل نگار و نقلے از یاقوت جام
بزمگاہے دلنشیں چوں قصر فردوس بریں	گلشنے پیرامنش چوں روضۂ دار السلام
صف نشیناں نیکخواہ و پیشکاران باادب	دوستداران صاحب اسرار و حریفاں دوستکام
نکتہ سنجے بذلہ گو چوں حافظ شیریں سخن	بخشش آموز و جہاں افروز چوں حاجی قوام

ہر کہ ایں صحبت نجوید خوشدلی از وے مجوے

وآنکہ ایں عشرت نخواہد زندگی بر وے حرام

بعض لوگوں نے جن میں کپتان کلارک بھی ہیں غلط فہمی سے حاجی قوام اور خواجہ قوام الدین عیار کو کہ وہ بھی حافظ کے مربیوں میں سے تھے ایک ہی شخص خیال کر لیا ہے۔ حالانکہ دونوں دو شخص تھے۔ حاجی قوام شاہ ابو اسحاق کے وزیر خزانہ تھے اُنھوں نے سنہ ۷۵۴ھ میں وفات پائی۔ اور خواجہ قوام شاہ شجاع کے وزیر تھے جنکا ذکر آگے آئے گا۔

امیر مظفر امیر مبارز الدین محمد مظفر ایک سپاہی منش اور سخت طبیعت کا آدمی تھا جب شیراز پر اس کا قبضہ ہوا تو اس نے بہت سختیاں کیں یہانتک کہ تمام لوگ اس کے دشمن ہو گئے اس کے بیٹے شاہ شجاع نے جب دیکھا کہ عنقریب ملک میں بغاوت ہونی چاہتی ہے تو امرا لشکر کے ساتھ متفق ہو کر سنہ ۷۶۰ھ میں مظفر کو گرفتار کر لیا۔ آنکھوں میں سلائی پھیر کر قید کر دیا۔ اور خود تخت سلطنت پر بیٹھا۔ کہا جاتا ہے کہ خواجہ نے یہ قطعہ اسی واقعہ کے متعلق لکھا ہے۔

شاہ غازی خسرو گیتی ستاں	آنکہ از شمشیر او خوں مے چکید
گہ بیک حملہ سپاہے مے شکست	گہ بہوئے قلب شیراں میدرید

عاقبت شیراز و تبریز و عراق — چوں مسخر کرد وقتش در رسید

آنکہ روشن بُد جہاں بینش بدو — میل در چشم جہاں بینش کشید

شاہ شجاع ابوالفوارس شاہ شجاع کے تخت نشین ہونے سے تمام لوگ بہت خوش ہوئے کیونکہ وہ خود عالم، علم دوست، اور بڑا دیندار تھا۔ علما و صلحا کی اس کے دربار میں بڑی قدر و منزلت ہوتی تھی۔ خواجہ نے بیسیوں غزلوں میں اس کا نام لیا ہے ایک غزل میں لکھتے ہیں ؎

جبین و چہرۂ حافظ خدا جدا مکناد — ز خاک بارگہ کبریائے شاہ شجاع

حافظ کی پیشانی اور چہرہ کو شاہ شجاع کی بارگاہ سے خدا جدا نکرے

شاہ شجاع خواجہ فقیہہ عماد[1] کرمانی کے ساتھ بہت عقیدت رکھتا تھا اور اسقدر اُن کو مانتا تھا کہ خود اُن کی خانقاہ میں جایا کرتا تھا۔

فقیہہ موصوف کے پاس ایک بلی تھی جس کی نسبت یہ مشہور تھا کہ جب فقیہہ نماز پڑھتے ہیں تو وہ بھی ساتھ ساتھ پڑھتی ہے۔ شاہ شجاع اس کو اُن کی کرامت سمجھتا تھا۔ خواجہ حافظ کو ایسی باتوں پر بھلا کب یقین آتا تھا۔ اُنھوں نے نہایت لطیف پیرائے سے ایک غزل میں فقیہہ موصوف پر چوٹ کی۔

عابد نہاد دام و سر حقہ باز کرد — آغاز مکر با فلک حقہ باز کرد

---

[1] زہد و اتقا میں مشہور زمانہ تھے تمام لوگ اور خاصکر مظفری خاندان کے شاہزادے ان کے ساتھ عقیدت رکھتے تھے باوجود علم و فضل اور زہد و تقوے کے نامور شاعر بھی تھے۔ ان کا یہ شعر بہت مشہور ہے۔

دل عکس رخ خوب تو در آب رواں دید — والہ شد و فریاد برآورد کہ ماہی

۷۷۳ھ میں وفات پائی۔ کرمان میں مدفون ہوئے۔ قبر زیارت گاہ ہے ایک دیوان یادگار ہے جو ہمارے سامنے موجود ہے۔ کلام نہایت سادہ اور حشو و زوائد سے پاک ہے۔

ساقی بیاکہ شاہد رعنائے صوفیاں   دیگر بجلوہ آمد و آغاز ناز کرد

اے دل بیاکہ تا بہ پناہ خدا ردیم   زانچہ آستین کوتہ و دست دراز کرد

اے کبک خوشخرام کجا میروی بایست   غرّہ مشو کہ گربۂ عابد نماز کرد

حافظ مکن ملامت رندان کہ در ازل

مارا خدا از زہد و ریا بے نیاز کرد

عبید زاکانی کی ایک مثنوی موش گربہ ہی۔ جس میں اس نے ایک بلّی کا قصہ لکھا ہی جو سینکڑوں چوہے کھاکر تائب ہوگئی اور عبادت میں مصروف ہوئی۔ چوہا اس کی خوشخبری اپنے بادشاہ کو دیتا ہی۔ ؎

مژدہ گانا کہ گربہ عابد شد   مومن و زاہد و مسلمانا

خوشخبری ہو کہ بلی عبادت گذار مومن زاہد اور مسلمان ہوگئی۔

اس قصہ سے "گربۂ عابد" مثل مشہور ہوگئی۔

خواجہ حافظ نے اس شعر میں اسی مثل کی طرف اشارہ کیا ہی۔

اے کبک خوشخرام کجا میروی بایست   غرّہ مشو کہ گربۂ عابد نماز کرد

اے ناز سے چلنے والی چکور کدھر جاتی ہی ٹھہر جا اس دھوکے میں نہ رہنا کہ عبادت گزار بلی نمازی ہوگئی

فقیہہ بھی تاک میں رہے۔ اتفاق سے خواجہ نے ایک غزل لکھی جسکا مقطع یہ تھا۔

فارس کا مشہور ہجوگو ہی شاہ ابو اسحاق کے زمانہ میں تھا پہلے اسکا اہل علم میں شمار ہوتا تھا۔ دولت شاہ کا بیان ہی کہ ۔یار کوئی کتاب علم معانی میں تصنیف کی۔ شاہ ابو اسحاق کی خدمت میں اس کو پیش کرنے کے لیے لے گیا۔ خدام نے اور یہ کہا کہ ابھی حضور ایک بھانڈ کی نقلوں میں دل بہلا رہے ہیں۔ عبید نے سوچا کہ جب بھانڈوں کی ایسی قدر ہی کہ اہل علم پران کو ترجیح دی جاتی ہی تو پھر لکھنا پڑھنا فضول ہی۔ اسی دن سے مولویت کا جبّہ اتارا اور ہزالی شروع ۔ وہ بھی ایسی مخش کہ اللہ کی پناہ ۷۷۱ھ میں مرگیا۔

گر مسلمانی ہمین است کہ حافظ دارد   آہ اگر از پس امروز بود فردائے

اگر اسی کا نام اسلام ہو جو حافظ رکھتا ہو تو نہایت افسوس ہو اگر آج کے بعد کل (قیامت) ہو

فقیہہ عماد نے شاہ شجاع سے کہا کہ اس شعر سے انکار قیامت لازم آتا ہے۔

شاہ شجاع چونکہ فقیہہ کا بڑا مرید تھا۔ اس نے حکم دیا کہ خواجہ حافظ بلائے جائیں۔ اور ان سے پوچھا جائے کہ آپ نے ایسا شعر کیوں کہا جس سے قیامت کا انکار لازم آتا ہے۔ خواجہ کو بھی یہ خبر لگ گئی۔ انھوں نے اس شاعرانہ مضمون کو سمجھانے کے بجائے یہ تدبیر کی کہ اس سے پہلے ایک شعر اور بڑھا کر اس کو ایک عیسائی کا مقولہ کر دیا ہے

ایں حدیثم چہ خوش آمد کہ سحر گہ میگفت   بر لب میکدۂ با دف و نے ترسائے

یہ بات مجھے بہت پسند آئی جو کہ صبح کو ایک شہراب خانہ کے دروازے پر بانسری اور دف بجا کر ایک عیسائی کہ رہا تھا

اب یہ ایک عیسائی کا قول ہو گیا۔ اور کفر کی نقل کفر نہیں ہوتی۔ اس وجہ سے شاہ شجاع خاموش ہو گیا۔ اور خواجہ نے خوش اسلوبی کے ساتھ فقیہہ کا داؤ کاٹ دیا۔

خواجہ قوام | شاہ شجاع کا وزیر خواجہ قوام الدین عیار بھی خواجہ کے قدردانوں میں سے تھا۔ ان کا وظیفہ بھی مقرر کر رکھا تھا چنانچہ ایک دفعہ وظیفہ پہنچنے میں کسی وجہ سے دیر ہوئی تو خواجہ نے ایک غزل لکھ کر وزیر موصوف کے پاس بھیجی۔ جس میں اس کی طرف توجہ دلائی۔ اس کا مطلع یہ ہے۔

رسید مژدہ کہ آمد بہار و سبزہ دمید   اگر وظیفہ رسد مصرفش گل ست و نبید

بہار کے آنے اور سبزہ کے اُگنے کی خوشخبری آگئی ایسی حالت میں اگر وظیفہ آئے تو گلاب شراب میں صرف کیا جائے

۷۶۴ھ میں شاہ شجاع نے کسی سیاسی غلطی کی وجہ سے اُن کو قتل کر ڈالا۔

توران شاہ | خواجہ قوام مقتول کے بعد خواجہ کمال الدین اور اُن کے بعد جلال الدین

توران شاہ شاہ شجاع کا وزیر ہوا یہ خواجہ کے کمالات کا فدائی تھا۔ اور اُن کیساتھ بڑا فیاضانہ سلوک کرتا تھا۔ خواجہ نے بہت سی غزلوں میں نہایت شکریہ کیساتھ وزیر موصوف کا نام لیا ہی۔ اپنی اس لاجواب غزل میں اس کی اخلاقی جراُت کی تعریف کی ہی۔

کجا برخیزد از دستم کہ با دلدار بنشینم — ز جام وصل مے نوشم ز باغ خلد گل چینم
صباح الخیر زد بلبل کجائی ساقیا برخیز — کہ غوغا میکند در سر نوائے چنگ دوشینم
شب رحلت ہم از بستر روم تا قصر حورالعین — اگر در وقت جان دادن تو باشی شمع بالینم
مگر دیوانہ خواہم شد دریں سودا کہ شب تا روز — سخن با ماہ میگویم پری در خواب مے بینم
لبت شکر بمستان داد و چشمت مے بمیخواراں — منم کز غایت حرماں نہ با آنم نہ با اینم
وفاداری و حق گوئی نہ کار ہر کسے باشد — غلام آصف دوراں جلال الحق والدینم

زین العابدین سنہ ۷۸۶ھ میں شاہ شجاع کے مرنے کے بعد اس کا بیٹا زین العابدین تخت نشین ہوا اگرچہ حسن میں اپنے زمانہ کا یوسف تھا لیکن کم عقل تھا۔ اس مغرور شاہزادے نے باپ کے مصاحبوں اور ملازموں کے ساتھ بدسلوکیاں شروع کیں۔ اور شیراز میں پھر دور مظفری تازہ ہوگیا۔

خواجہ کی غزلیں اور خاصکر نئی غزلیں جو وہ لکھتے تھے بادشاہوں اور شاہزادوں کی مجلسوں میں گائی جاتی تھیں۔ اُنھوں نے اس زمانہ میں جسقدر غزلیں لکھی ہیں ان میں اس کو خصوصیت کے ساتھ رحم اور دادگری کی طرف توجہ دلائی ہی منجملہ ان کے ایک غزل یہ ہے۔

بہ ملازمان سلطان کہ رساند ایں دعا را — کہ بشکر بادشاہی ز نظر مراں گدا را
چہ قیامت است جانا کہ بعاشقاں نمودی — رُخ ہمچو ماہ تاباں دل ہمچو سنگ خارا

زرقیب دیوسیرت بخدا اہی پناہم | مگر آں شہاب ثاقب مددے کند سہارا

دل عالمے بسوزی چو عذار برفروزی | توازیں چہ سود داری کہ نمی کنی مدارا

مژہ سیاہت ارکرد بخون ما اشارت | زفریب او بیندیش غلط مکن نگارا

ہمہ شب دریں امیدم کہ نسیم صبحگاہی | بہ پیام آشنائے بنوازد آشنا را

بخدا کہ جرعۂ دہ تو بحافظ سحرخیز

کہ دعائے صبحگاہی اثرے کند شمارا

مثل مشہور ہی کہ ظلم کی عمر تھوڑی ہوتی ہی۔ ابھی ایک سال بھی نہ گزرنے پایا تھا کہ ۷۸۹ھ میں شہنشاہ تیمور ایک گرجتے برستے بادل کی طرح آن پہنچا۔ زین العابدین نے مقابلے کے لیے لشکر فراہم کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ آخر خوف کے مارے صاحبقراں کے آنے سے پہلے ہی شیراز سے بھاگا۔ اور اپنے چچا منصور کے پاس تستر میں پہونچا۔

تیمور نے شیراز کو خالی پاکر اس پر قبضہ کرکے شاہ شجاع کے بھائی نصرت الدین یحییٰ کو جو یزد پر حکمران تھا اور جس نے اسکی اطاعت تسلیم کرلی تھی شیراز کو بھی سپرد کردیا۔

تیمور نے شیراز میں خواجہ کو بھی یاد کیا جن کی شہرت وہ عرصہ سے سن رہا تھا۔ خواجہ تشریف لے گئے۔ وہ بہت اعزاز سے پیش آیا اور پوچھا کہ یہ شعر آپ کا ہی؟

اگر آں ترک شیرازی بدست آرد دل مارا | بخال ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را

خواجہ نے کہا ہاں۔ اس نے کہا کہ میں نے جو بڑی بڑی فوجوں سے لڑکر دنیا فتح کی اور بھاری بھاری سلطنتوں پر قبضہ کیا تو اس لیے کہ سمرقند اور بخارا کو جو میرے وطن ہیں آباد کروں اور آپ نے ان کی یہ قدر کی کہ معشوق کے خال ہندو پر تصدق کر ڈالا۔ خواجہ نے جواب دیا کہ جہاں پناہ! یہ اسی غلط بخشی کا نتیجہ ہی کہ آج میرا حال

میں ہوں۔ تیمور اس لطیفہ سے بہت خوش ہوا۔ اور خواجہ کو خلعت اور انعام سے سرفراز کیا
انسائی کلوپیڈیا برٹانیکا کا مصنف اس واقعہ سے انکار کرتا ہے۔ اور یہ کہتا ہے کہ تیمور شیراز
میں خواجہ کے انتقال کے کئی سال بعد گیا تھا۔ لیکن اسے یہ خبر نہیں کہ تیمور دو مرتبہ شیراز
میں آیا ہے۔ پہلی مرتبہ ۷۸۹ھ میں جب کہ خواجہ زندہ تھے۔ دوبارہ ۷۹۵ھ میں جب کہ وہ
وفات پاچکے تھے۔

شاہ یحییٰ شیراز کے تمام لوگ تیمور کے آنے سے ڈر گئے تھے۔ مگر جب اس نے وہاں کی
حکومت شاہ یحییٰ کے سپرد کردی تو ان کو بڑی خوشی ہوئی کیوں کہ یحییٰ بہت لایق اور منصف
مزاج بادشاہ تھا۔ خواجہ ایک غزل میں کہتے ہیں۔

گر نہ بودے شاہ یحییٰ نصرت الدین از کرم کار ملک و دین زنظم و انتساق افتادہ بود

اگر شاہ یحییٰ نصرت الدین کی ذات بابرکات نہوتی تو ملک و دین کا نظم و نسق خراب ہو چکا تھا۔

شاہ منصور زین العابدین جب تستر بھاگ کر گیا تو اس کے چچا منصور نے اسکی
بزدلی پر اُس کو قید کردیا اور خود ایک بہت بڑی جمعیت فراہم کرکے شیراز کی طرف آیا۔
شاہ یحییٰ کو مقابلہ میں ناکامیابی ہوئی اور آخر وہ میدان میں مارا گیا۔ منصور بڑے کروفر
سے شیراز میں داخل ہوا۔

اہلِ شیراز نے منصور کا بڑی خوشی سے خیر مقدم کیا۔ کیوں کہ تمام آلِ مظفر میں اس سے
زیادہ لایق، بہادر اور عادل کوئی شہزادہ نہ تھا۔ خواجہ نے بھی ایک غزل اس کے خیر مقدم
میں لکھی جس کا مطلع یہ ہے۔

بیا کہ رایتِ منصور بادشاہ رسید نوید فتح و بشارت بمہر و ماہ رسید

آجاؤ کہ شاہ منصور کا جھنڈا آگیا اور فتح کی نوید اور خوشخبری چاند اور سورج تک پہونچ گئی۔

شاہ منصور خواجہ کا بہت احترام کرتا تھا اور اُن کے کمالات کا بڑا قدرداں تھا۔ خواجہ نے جابجا غزلوں میں اس کی تعریف کی ہے۔

واپسی میں تیمور نے منصور کا بھی خاتمہ کر دیا اور اس کے خاتمے کے ساتھ ہی خاندان مظفری کا چراغ گُل ہو گیا۔ مگر خواجہ اس سے کئی سال پہلے ہی انتقال فرما چکے تھے۔

اِن کے علاوہ بڑے بڑے امرا اور روسا مثلاً فخر الدین، عبد الصمد، امین الدین حسن وغیرہ خواجہ کے خاص عقیدت مندوں میں سے تھے وہ اپنے تقدس، زہد، علم اور خدا داد شاعرانہ کمال کی وجہ سے ہر طبقہ اور ہر درجے کے لوگوں میں عام مقبولیت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ اور اپنی زندگی میں انتہائی ہر دلعزیزی جو کسی باکمال کو حاصل ہو سکتی ہے اُن کو حاصل تھی۔

خواجہ کی شہرت

گذشتہ زمانے میں اکثر اہل کمال کی شہرت اُن کے مرنے کے بعد ہوتی تھی۔ لیکن خواجہ اُن خوش قسمت لوگوں میں سے ہیں جنکی شہرت زندگی ہی میں چار دانگ عالم میں پھیل گئی۔ نہ صرف ایران بلکہ بغداد، عراق، جنوبی ہند اور بنگالہ تک ان کی زندگی ہی میں ان کا نام مشہور ہو چکا تھا۔ قافلوں کے ساتھ ساتھ اُن کی غزلیں ملکوں ملکوں جاتی تھیں۔ بڑے بڑے بادشاہوں اور نوابوں نے ان کو بلانا شروع کیا۔ اُن کے پاس تحفے تحائف اور اشتیاق نامے بھیجتے تھے۔ لیکن خواجہ اپنی سیر چشمی اور گوشہ نشینی کی وجہ سے کہیں جانا پسند نہیں کرتے تھے۔

سلطان احمد جلائر ایلکانی[۱] کو بڑی خواہش تھی کہ خواجہ بغداد میں تشریف لائیں۔

---

[۱] ایلکانی سلطنت کا بانی امیر حسن نوئنان ہے اس کے باپ کا نام امیر قبو قا ہے جو امیر ایلکان کا بیٹا تھا۔ امیر ایلکان

بہت سے تحائف اور خطوط بھیجے لیکن خواجہ نہیں گئے۔ ایک غزل بطور شکریہ کے لکھکر بھیجدی جس کا ایک شعر یہ ہے۔

گرچہ دوریم بیادِ تو قدح مے نوشیم ! بُعدِ منزل نبود در سفرِ روحانی

اگرچہ ہم دور ہیں لیکن آپ کی یاد میں شراب پیتے ہیں روحانی سفر میں فاصلہ کوئی چیز نہیں ہے۔

شاہ شجاع کا بھائی قطب الدین محمود جو اصفہان کا حاکم تھا۔ اس میں اور شاہ شجاع میں سخت لڑائیاں ہوئیں۔ اور چونکہ سلطان احمد والی بغداد کی بہن قطب الدین محمود کے نکاح میں تھی اس وجہ سے وہاں سے بھی اس کو امداد ملی اس نے شیراز کا محاصرہ کرلیا۔ مجبوراً شاہ شجاع نے اس سے صلح کرلی کچھ دنوں کے بعد محمود مرگیا شاہ شجاع نے یہ رباعی لکھی۔

محمود برادرم شہ شیر کمیں میکرد خصومت از پے تاج و نگیں
کردیم دو بخش تا بیا ساید خلق او زیر زمیں گرفت من روئے زمیں

اس کے مرنے کے بعد شاہ شجاع کو سلطان احمد سے انتقام لینے کا موقع ملا اور دونوں میں خوب باہم لڑائیاں رہیں۔ کچھ عجب نہیں کہ خواجہ کے بغداد نہ جانے کا سبب ان بادشاہوں کی باہمی عداوت ہوئی ہو ورنہ ان کو وہاں جانے کی بڑی آرزو تھی فرماتے ہیں ؎

رہ نبردیم بمقصودِ خود اندر شیراز خرم آں روز کہ حافظ رہِ بغداد کند

شیراز میں اپنے مقصود تک ہم نہیں پہنچ سکے وہ دن بڑا اچھا ہوگا جبکہ حافظ بغداد کو روانہ ہوگا۔

صفحہ ۲۹ ۔ کنجا تیمور خاں کے زمانہ میں امیر الامرائی کا منصب رکھتا تھا۔ بعد ازاں اسکا پوتا امیر حسن سلطان ابوسعید خاں کے زمانہ میں خراسان میں کسی ممتاز منصب پر سرفراز ہوگیا سلطان ابوسعید خاں کے مرنے کے بعد جب انقلاب واقع ہوا تو بغداد اور تبریز وغیرہ پر امیر حسن نے قبضہ کرکے ایلکانی حکومت قائم کرلی امیر حسن کے بعد اسکا بیٹا شیخ اویس تخت نشین ہوا۔ اویس کا بیٹا احمد ہے

سلطان قطب الدین کے وزیر عماد الدین محمود نے بھی اصفہان سے خواجہ کو طلب کیا لیکن غالباً انہیں ملکی جھگڑوں کی وجہ سے خواجہ نے وہاں جانا بھی مناسب نہیں سمجھا ایک دفعہ ایک غزل جو "بہاریہ" کے نام سے مشہور ہے لکھکر وزیر موصوف کے پاس بھیجدی تھی اس نے بڑی قدردانی کی اور صلہ بھیجا اس غزل کے چند شعر یہ ہیں۔

کنونکہ در چمن آمد گل از عدم بوجود	بنفشہ در قدم او نہاد سر بسجود
بباغ تازہ کن آئین دین زردشتی	کنونکہ لالہ برافروخت آتش نمرود
چو گل سوار شود بر ہوا سلیمان وار	سحر کہ مرغ در آید بنغمۂ داؤد
بخواہ جام صبوحی بیاد آصف عہد	وزیر ملک سلیمان عماد دین محمود

جنوبی ہند میں اس زمانہ میں سلطان محمود شاہ بہمنی حکمران تھا میر فضل اللہ انجو علامہ تفتازانی کے شاگرد رشید تھے سلطان کے وزیر تھے۔ خواجہ کا شہرہ مدت سے سنتے تھے۔ ایک دفعہ علم دوست بادشاہ کے اشارہ سے خواجہ کے نام ایک خط لکھا جسمیں اُن سے خواہش کی گئی تھی کہ وہ دکن میں تشریف لائیں۔ خط کے ہمراہ اشرفیاں بھی بطور زاد راہ کے بھیجیں تھیں۔ خواجہ نے ان اشرفیوں میں سے اپنا قرضہ ادا کیا۔ کچھ بھانجوں کو دیا۔ اور باقی ماندہ سے زاد راہ تیار کر کے ہندوستان کو روانہ ہوئے راستہ میں فیاضی نے مفلس کر دیا۔ ایران کے دو سوداگروں خواجہ زین العابدین ہمدانی اور خواجہ محمد گازرونی نے جو معتبر تاجر تھے اور ہندوستان کو آرہے تھے خواجہ کے اخراجات سفر کی کفالت اپنے ذمہ لی اور بندرگاہ "ہرمز" پر پہونچے۔

دکن کا ایک جہاز ہرمز سے واپس آرہا تھا اس پر سوار ہوئے۔ اتفاق یہ کہ ابھی لنگر اُٹھا بھی نہیں تھا کہ طوفانی ہوا چلی گھبرا گئے۔ آخر کشتی کنارہ پر لگائی گئی۔ اُتر گئے

اور ہندوستان آنے کا ارادہ فسخ کردیا انہیں سوداگروں کے ہاتھ میر فضل اللہ انجو کے پاس یہ غزل لکھکر بھیجدی۔

دمے با غم بسر بردن جہان یکسر نمی ارزد — بمے بفروش دلق ماکزیں خوشتر نمی ارزد

شکوہ تاج سلطانی کہ بیم جاں درو درج است — کلاہ دلکش است اما بہ ترک سر نمی ارزد

بکوئے میفروشانش بجامے برنمیگیرند — زہے سجادۂ تقوائے کہ یک ساغر نمی ارزد

ترا آں بہ کہ روئے خود ز مشتاقاں بپوشانی — بشادی جہانداری غم لشکر نمی ارزد

رقیبم سرزنش ہا کرد کز ایں باب رخ برتاب — چہ افتاد ایں سر ما را کہ خاک در نمی ارزد

بس آساں مے نمود اول غم دریا ببوئے سود — غلط گفتم کہ ہر موجش بصد گوہر نمی ارزد

برو گنج قناعت جو بکنج عافیت حافظ

کہ یکدم تنگدل بودن ببحر و بر نمی ارزد

میر فضل اللہ نے یہ قصہ بادشاہ سے بیان کیا۔ اُس کو بڑا افسوس ہوا اور کہا کہ خواجہ ہمارے ارادہ سے چلے لیکن ہماری بدقسمتی نے اُن کو ہم تک نہ پہنچنے دیا۔ اس لیے مناسب یہ ہی کہ ہم اپنے انعام سے اُن کو محروم نہ کریں چنانچہ ملا محمد قاسم مشہدی کے ہات ایکہزار تنکہ طلا اور ہندوستان کے بہت سے بیش قیمت تحفے خواجہ کے پاس بھجوائے۔

سلطان غیاث الدین والی بنگالہ متوفی ۸۱۵ھ جو علم کا بڑا قدردان اور نہایت فیاض تھا اس نے اپنے خاص خادم یاقوت کے ہات کچھ زر نقد اور تحفے خواجہ کے پاس بھیجے اور خواہش کی کہ وہ بنگال میں تشریف لائیں خواجہ سفر سے پہلے ہی توبہ کرچکے تھے معذرت کی اور یہ غزل لکھکر یاقوت کو دیدی۔

ساقی حدیث سرو و گل و لالہ میرود | وین بحث با ثلاثہ غسالہ میرود

مے دہ کہ نوعروس جہاں حد حسن یافت | کار این زماں ز صنعت دلالہ میرود

آن چشم جادوانہ عابد فریب بین | کش کاروان سحر بدنبالہ میرود

خوے کردہ میخرامد و بر عارض سمن | از شرم روئے او عرق از ژالہ میرود

باد بہار میوزد از بوستان شاہ | وز ژالہ بادہ در قدح لالہ میرود

طے مکاں ببین و زمان سلوک شعر | کین طفل یکشبہ رہ یکسالہ میرود

شکر شکن شوند ہمہ طوطیان ہند | زین قند پارسی کہ بہ بنگالہ میرود

حافظ ز شوق مجلس سلطان غیاث دین

خامش مشو کہ کار تو از نالہ میرود

فرشتہ۔ اس کے متعلق ایک عجیب قصہ لکھتا ہے۔ کہ سلطان غیاث الدین ایک دفعہ سخت بیمار ہوا۔ اس کے یہاں تین لونڈیاں تھیں جن کے نام سرو گل اور لالہ تھے انھوں نے سلطان کی بیماری کے زمانہ میں بہت خدمت کی اور جب صحت ہوگئی تو روزانہ نہلاتی تھیں سلطان ان سے بہت خوش تھا اور زیادہ محبت کرتا تھا یہانتک کہ بیگمات کو ان پر رشک آنے لگا انھوں نے طنز سے ان کو غسالہ کہنا شروع کیا۔ غیاث الدین نے جب سنا تو ہنسا اور بے ساختہ اسکی زبان سے یہ مصرع نکل گیا۔

ساقی حدیث سرو و گل و لالہ میرود

دوسرا مصرع نہیں لگتا تھا۔ دربار کے شاعروں کو بلوایا وہ بھی کوئی اچھا مصرع نہیں لگا سکے خواجہ حافظ کی شہرت تو سنی ہی تھی ان کے پاس شیراز میں یہ مصرع بھیجدیا چنانچہ اسی مصرع پر غزل انھوں نے پوری کی۔

خواجہ نے اس مصرع پر جو مصرع لگایا ہی یعنی "دیں بحث با ثلاثہ غسالہ میرود" اس میں لطف یہ ہی کہ ثلاثۂ غسالہ کے معنی تو ہیں تین نہلانے والیاں لیکن بادہ خواروں کی اصطلاح میں شراب کے ان تین پیالوں کو کہتے ہیں جو صبح کو پیئے جاتے ہیں اور جن سے شب کا خمار اور تمام رنج و غم دُھل جاتا ہی۔

خواجہ کا تقدس

خواجہ حافظ عالم فقیہہ اور مفسر تھے اور گو مولانا جامی کو ان کے مرشد کا پتہ نہیں لگ سکا لیکن منتخب التواریخ میں ہی کہ وہ خواجہ بہارالدین نقشبند رح کے مرید تھے۔

جب خواجہ بہارالدین نقشبند رح بخارا سے حج کو جا رہے تھے تو شیراز میں بھی کچھ دنوں کے لیے قیام فرمایا۔ کہا جاتا ہی کہ حافظ نے حضرت موصوف ہی کی آمد پر یہ غزل لکھی تھی۔

مژدہ اے دل کہ مسیحا نفسے می آید   کہ ز انفاسِ خوشش بوئے کسے می آید

ان کی صحبت کے فیض سے شرح صدر حاصل ہوگیا اور دل پر عرفان کا دروازہ کھل گیا ایک غزل میں اس کی طرف اشارہ بھی کیا ہی جس کا ایک شعر یہ ہی۔

بارِ غمے کہ خاطرِ ما خستہ کردہ بود   عیسیٰ دمے خدا بفرستاد و برگرفت

حج کرنے کے بعد واپسی میں بھی وہ یہاں تشریف لائے خواجہ نے کئی غزلوں میں ان کی جدائی اور رنج انتظار کی کیفیت کو ظاہر کیا ہی۔ خیر مقدم کے طور پر ایک غزل ان کی خدمت میں لکھکر بھیجی تھی جس کا مطلع یہ ہی۔

رواقِ منظرِ چشمِ من آشیانۂ تست   کرم نما و فرود آ کہ خانہ خانۂ تست

بعض لوگ لکھتے ہیں کہ خواجہ مجذوب سالک یعنی دیوانے صوفی تھے ایک شخص لکھتا ہو کہ وہ ملامتیہ فرقہ سے تھے یعنی اپنی ظاہری حالت گنہگاروں کی سی رکھتے تھے تاکہ جو شخص دیکھے ملامت کرے اور دل میں کسی قسم کا تکبر نہ آنے پائے مگر یہ ایسی غلط باتیں ہیں کہ انکی تردید کی ضرورت نہیں۔ خواجہ آخر عمر تک مدرسہ میں تعلیم دیتے رہے۔ بادشاہوں کے درباروں میں اُن کا آنا جانا ہوتا تھا کہیں کہیں اپنی غزلوں میں نصیحت بھی کرتے ہیں وہ عام طور پر لوگوں کی نگاہ میں معزز اور محترم سمجھے جاتے تھے نہ کہ دیوانہ یا قابل ملامت تمام تذکرہ نویس ان کو ایک باوقار عالم اور صوفی لکھتے ہیں۔

بعض یورپین مصنفوں نے جن کو فارسی شاعری کی اصلیت کا بہت کم اندازہ ہی مثلاً بکنل اور انسائی کلوپیڈیا برٹانیکا کا مصنف۔ ان لوگوں نے خواجہ کے اشعار کو دیکھکر اور ان کو واقعی سمجھکر خواجہ کو شراب خوار اور رند لکھا ہی۔

لیکن اگر ان لوگوں نے ذرا بھی اُن کے حالات لکھنے میں تحقیق کی ہوتی اور اولیاء اللہ کے تذکرے اُٹھا کر دیکھتے تو معلوم ہو جاتا کہ وہ بہت بڑے بزرگ و ولی اللہ تھے اور جب کہ ایک معمولی مسلمان بھی شراب خواری اور رندی سے پرہیز کرتا ہی تو ایک ولی اللہ ان میں کیونکر مبتلا ہو سکتا ہی۔ کیونکہ ولایت کا درجہ حاصل کرنے کے لیے شرعی پابندیوں کے ساتھ بہت زیادہ ریاضت اور نفس کشی کرنی پڑتی ہی۔ شراب خواری اور رندی کے ساتھ تزکیہ نفس حاصل نہیں ہو سکتا۔ ع

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا

اصلیت یہ ہی کہ فارسی یا اردو کے شاعر کے کلام سے اس کی اصل حالت کا اندازہ کرنا بہت بڑی غلطی ہی کیونکہ فارسی یا اُردو شاعری میں خاص خاص عنوان مقرر ہیں انہیں پر

شاعری ہوتی ہے۔ خواہ رند ہو خواہ پارسا دونوں شاعری کے کوچہ میں یکساں ہیں بڑے بڑے مقدس لوگ جن کے لبوں کو شراب کبھی چھو بھی نہیں گئی وہ بھی شاعری کی شاہراہ میں بغل میں صراحی اور ہات میں ساغر لیے ہوئے نظر آئیں گے۔ اور جام پر جام اڑائیں گے اس لیے کہ مشکل یہ ہے کہ صوفیانہ کلام میں وہ کیفیات بیان کی جاتی ہیں جو انسان کے دل پر ریاضت اور مجاہدہ سے طاری ہوتی ہیں ان کے بیان کرنے کے لیے دنیا کی کسی زبان میں الفاظ موجود نہیں ہیں خواجہ خود اس دشواری کے متعلق کہتے ہیں ؎

چو نہیں گرہ کشایم۔ ویں راز دل نمایم
درے وسخت دشوارے۔ کارے سخت کاری

میں کیونکر دل کی گرہ کھول کے اپنے راز تم کو دکھلاؤں یہ تو نہایت ہی مشکل اور دشوار امر ہے۔

مجبوراً ان کیفیات کو عشق مجازی مے ومستی اور گل وبلبل کے افسانوں میں ادا کرنا پڑتا ہے اور حقیقی مستی کی شراب طہور یا بادۂ انگور سے تعبیر کی جاتی ہے۔ غالب نے صحیح کہا ہے ؎

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ وساغر کہے بغیر

شراب خواروں کے متعلق خواجہ کہتے ہیں ؎

مستی عشق نیست در سر تو
رو کہ تو مست آب انگوری

عشق کی مستی تمہارے اندر نہیں ہے تم یہاں سے چلے جاؤ کیونکہ تم تو شراب انگور سے مست ہو۔

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ حافظ وسعدی وغیرہ حقیقت میں متقی اور پرہیزگار تھے تو ایسے ایسے باریک اور اعلیٰ درجے کے رندانہ اور عاشقانہ مضامین کیونکر ان کے دماغ میں آتے تھے مگر جب یہ بات معلوم ہوگئی کہ فارسی شاعری کی بنیاد انہیں مضامین پر ہے اور کوئی عاشق ہو یا نہ ہو لیکن اسی قسم کے مضامین لکھنے پڑتے ہیں تو یہ بات واضح ہوگئی

کہ حافظ اور سعدی وغیرہ کو بھی بحیثیت شاعر کے ایسے ہی خیالات ادا کرنے ضروری تھے ورنہ با وجود صلاح و تقوے کے ایسے مضامین کا پیدا کرنا کچھ مشکل نہیں ہے۔ ایک مفلس اور محتاج شخص اپنے خیال میں اعلیٰ سے اعلیٰ جاہ و جلال کی تصویر کھینچ سکتا ہے۔ علاوہ بریں ان لوگوں کا زہد ہر خشک نہ تھا وہ اپنے دلوں میں عشق حقیقی کی آگ رکھتے تھے اس وجہ سے عاشقانہ کلام میں جو گرمی وہ پیدا اسکے دوسرا نہ کرسکا۔

اصلیّت یہ ہے کہ فارسی یا اُردو شاعری ایک بناوٹ کا نام ہے جس کے لیے واقعیّت کی کوئی ضرورت نہیں۔

ایک بار آگرہ میں مجھے ایک مشاعرہ میں شریک ہونے کا اتفاق ہوا ایک صاحب تنہیم شحیم صدر میں بیٹھے تھے بلا مبالغہ اُن کا وزن تین من سے کم نہ ہوگا جب ان کے سامنے شمع آئی تو اُنھوں نے اپنی غزل سُنانی شروع کی جس کا مطلع یہ تھا۔

اسدرجہ رنج ہجر نے لاغر کیا مجھے بستر پر آکے ڈھونڈ رہی ہے قضا مجھے

کہاں تو ان کا وہ تن و توش اور کہاں یہ لاغری۔ بھلا اس سے اصلیّت کا اندازہ کیسے کیا جائے۔

یہانتک کہ اُردو میں جس میں تذکیر و تانیث کا امتیاز کیا جاتا ہے کسی عورت کے لیے بھی اگر وہ شاعری کرے تو یہ لازم ہوگا کہ اپنے واسطے مذکر کا صیغہ استعمال کرے کیونکہ اُردو شاعری میں بھی فارسی شاعری کی طرح مرد ہی عاشق اور مرد ہی معشوق قرار پایا ہے مثلاً ایک بیگم جس کا تخلص حجاب ہے کہتی ہے ؎

نہیں چین آتا اُسے ایک دم بھی ہوا تا جو رجب سے شیدا کسی کا

اس تصنّع کا کیا ٹھکانا ہے!

ہاں فارسی اور نیز اُردو میں ایسے اشعار بھی ہوتے ہیں جن میں شاعر کسی اصلی واقعہ کو

کو ظاہر کرتا ہے لیکن وہ صاف پہچانے جاتے ہیں۔

ایک یورپین مورخ خواجہ کے حالات لکھتے ہوئے بڑی دھوم دھام سے یہ روایت نقل کرتا ہے جو ہمارے یہاں جہلا میں مشہور ہے کہ خواجہ ایک مفتی زادہ پر جس پر شاہ شجاع عاشق تھا فریفتہ ہوگئے۔ ایک دن اتفاق سے اس کے ساتھ محل شاہی کے پچھواڑے میونوشی میں مشغول ہوئے۔ وہ اپنے خیال میں خلوت میں تھے لیکن شاہ شجاع اس حرکت کو جھروکے سے دیکھ رہا تھا جوں ہی خواجہ نے شراب کا پیالہ بھر کے مفتی زادہ کو دیا بادشاہ نے پکار کے کہا۔ ع

حافظا قرابہ کش شد و مفتی شراب نوش

خواجہ کے لیے جب وہ ایک ناپسندیدہ کام میں مخفی طور پر مشغول تھے یہ آواز بدحواس کردینے والی تھی مگر اُنھوں نے اپنی تیزی طبیعت سے فوراً اس پر دوسرا مصرع لگادیا ع

در عہد بادشاہ خطابخش وجرم پوش

شاہ شجاع اس حاضر جوابی پر پھڑک اُٹھا اور خواجہ کی خطا سے درگزرا۔

اس روایت سے جو بھنگیر خانہ کی گپ سے زیادہ نہیں ہے اور جس کی ایک احمق سے احمق اور بھولے سے بھولا بچہ بھی تصدیق نہیں کریگا۔ وہ یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ حافظ بڑے شرابخوار اور عشقباز تھے اور لطف یہ ہے کہ اسی پر بس نہیں کرتا بلکہ یہ بھی لکھتا ہے کہ "حقیقت میں شاہ شجاع کی عیاشی کی وجہ سے اس کے زمانہ میں شراب خواری اور عشق بازی کا بہت زیادہ چرچا ہوگیا تھا"

کاش اس مورخ نے کوئی تاریخ بھی فارس کی اُٹھا کر پڑھی ہوتی تو اُسے معلوم ہوجاتا کہ تمام شاہان شیراز میں شاہ شجاع بہت بڑا عالم اور نہایت درجہ کا پابند شرع اور حافظ

قرآن تھا خود خواجہ اس کی تعریف میں کہتے ہیں ؎

مظہر لطف ازل روشنی چشم امل — جامع علم و عمل جان جہاں شاہ شجاع

اس کا زمانہ شیراز کے لیے شریعت اور مذہب کا زمانہ تھا۔ ایک بات ضرور تھی کہ امیر مظفر نے شراب خانے بند کر دیئے تھے اور شاہ شجاع کے زمانہ میں تجارت کی آزادی کی وجہ سے پھر شراب کی دکانیں کھل گئیں۔ اسی کا بعض جگہ خواجہ نے مذاق اڑایا ہے ؎

سحر ز ہاتف غیبم رسید مژدہ بگوش — کہ دور شاہ شجاع است مے دلیر بنوش

صبح کو ہاتف غیب نے یہ خوشخبری میرے کانوں کو سنائی کہ شاہ شجاع کا زمانہ ہے بے کھٹکے بندو شراب پیو

ایسے متشرع بادشاہ اور حافظ جیسے ولی اللہ کے متعلق اس قسم کا غلط اندازہ کرنا فارسی تاریخ سے جہالت کی دلیل ہے۔

اور دیکھو تو خلوت بھی تلاش کریں تو کہاں۔ شاہی محل کے جھروکے سے جہاں بادشاہ خود ہی جھانکتا ہو۔ سبحان اللہ۔ ع

جاسوس سلطان در کمین معشوق سلطان در بغل

تمام تذکرہ نویس اس بات پر متفق ہیں کہ خواجہ بہت بڑے بزرگ اور ولی اللہ تھے ہر شب جمعہ کو قرآن ختم کرتے تھے اور رات کے پچھلے حصے میں اوراد و وظائف پڑھتے تھے۔ ان کے تمام اوقات علمی مشغلوں، ریاضت اور عبادت میں صرف ہوتے تھے پھر اس قسم کے خرافات ان کے دامن زہد و صلاح پر کیا دھبہ لگا سکتے ہیں۔

چارلس اسٹورٹ جنے سلطان ٹیپو کے کتب خانہ کی فہرست مرتب کی لکھا ہے کہ

حافظ پرہیزگاری میں مشہور ہے۔ اس کا تمام وقت خدا کی عبادت اور ریاضت میں صرف ہوتا تھا

فارس کے لوگ اس کو ایک ولی اللہ اور مقدس بزرگ سمجھتے ہیں اور عاشقانِ الٰہی اس کا کلام کثرت سے پڑھتے ہیں۔

خود دیوان میں ایسے بہت سے اشعار ہیں جن سے ان کے زاہد و عابد ہونے کا پتہ لگتا ہے مثلاً

ہر گنج سعادت کہ خدا داد بہ حافظ — از یمنِ دعائے شب و وردِ سحری بود

نیک بختی کا جو ذخیرہ کہ خدا نے حافظ کو عنایت کیا ہے وہ دعائے شب اور وظیفہ سحری کی برکت سے ملا ہے

بہ ہیچ وجہ دگر نیست حاجت اے حافظ — دعائے نیم شب و وردِ صبحگاہت بس

حافظ تجھکو کسی دوسرے ذریعہ کی حاجت نہیں ہے آدھی رات کی دعا اور صبح کا وظیفہ تیرے لیے کافی ہے

اسی طرح کا ایک اور واقعہ مفتاح التواریخ کا مصنف طامس ولیم لکھتا ہے کہ خواجہ کے ایک کرمفرما امین الدین حسن اصفہان کے بہت بڑے رئیس تھے۔ خواجہ اُنکی ملاقات کو گئے۔ جب اصفہان پہونچے تو قبل اس کے کہ ان سے ملیں۔ ان کے غلاموں نے ان کو شرابی سمجھکر پکڑ لیا اور تشہیر کرنی شروع کی۔ آدھے شہر میں تشہیر کر چکے تھے کہ امین الدین کو خبر لگ گئی۔ وہ دوڑے ہوئے آئے خواجہ سے معافی مانگی اور عزت و احترام کے ساتھ لاکر ان کو اپنے مکان میں اُتارا۔ غلاموں کو سزائیں دیں۔ خواجہ نے شکر گزاری میں یہ غزل لکھی۔

مرا عہدیست با جاناں کہ تا جاں در بدن دارم — ہواداری کویش را چو جانِ خویشتن دارم

مرا در خانہ سروے ہست کاندر سایۂ قدش — فراغ از سرو بستانی و گلہائے چمن دارم

بکامِ آرزوئے دل چو دارم خلوتے حاصل — چہ باک از خبث بدگویاں میانِ انجمن دارم

صفائے خلوتِ خاطر ازاں شمعِ چگل جویم — فروغِ چشم و نورِ دل ازاں ماہِ ختن دارم

گرم صد لشکر از خوباں بقصد دل کمیں سازند — بحمد اللہ والمنۃ بت لشکر شکن دارم

سزد گر خاتم لعلش زند لاف سلیمانی — چو اسم اعظمم باشد چہ باک از اہرمن دارم

خدا را اے رقیب امشب زمانے چشم برہم نہ — کہ من با لعل خاموشش نہانی یک سخن دارم

الا اے پیر فرزانہ مکن عیبم ز میخانہ — کہ من در ترک پیمانہ دلے پیماں شکن دارم

شراب خوشگوارم ہست و یار مہرباں ساقی — ندارد ہیچ کس یارے چنیں یارے کہ من دارم

برندی شہرہ شد حافظ پس از چندیں ورع اما
چہ غم دارم کہ در عالم امین الدین حسن دارم

اس مقطع کو دیکھکر غالباً یہ روایت گھڑی گئی ہے۔ یہ اور اسی قسم کی اور کئی ایک روایتیں جہلاء کی محفلوں کو گرمانے کے لیے بھانڈوں اور نقالوں نے تراش رکھی ہیں جو اپنی تردید آپ ہی کرتی ہیں۔

کیا مضحکہ خیز بات ہے کہ غلاموں نے بدمستی میں تشہیر کرنی شروع کی۔ دنیا میں کہیں ایسے غلام دیکھے نہ سنے جو قاضی و محتسب شہر کے فرائض بجا لاتے ہوں۔

ہمارے نزدیک یہ سب روایتیں خواجہ کی عظمت اور ہردلعزیزی کی دلیل ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ نہ صرف پڑھے لکھے لوگوں میں وہ مقبول ہیں بلکہ جہلاء اور عوام بھی ان کے ساتھ کم دلچسپی نہیں رکھتے اور محفلوں میں ان کا ذکر چھیڑنے کے لیے طرح طرح کی عجیب و غریب روایتیں گھڑتے ہیں۔

خواجہ کے اوپر ان کی زندگی ہی میں معتزلی ہونے کا الزام البتہ لگایا گیا تھا جس کی وجہ یہ تھی کہ ان کو تفسیر کشاف سے جو ایک معتزلی پیشوا علامہ جار اللہ زمخشری کی تصنیف ہے عشق تھا۔ چنانچہ انھوں نے اس پر حاشیہ بھی لکھا ہے بعض لوگوں

اس وجہ سے اُن کو معتزلی کہا۔

محمدؐ دارابی نے اس الزام کو خواجہ پر سے رفع کرنے کی کوشش کی ہی۔ وہ لکھتا ہی کہ خواجہ معتزلی نہ تھے اس وجہ سے کہ معتزلہ بندہ کو اپنے افعال کا خالق اور مختار مانتے ہیں اور خواجہ مجبور محض سمجھتے ہیں چنانچہ کہتے ہیں ؎

گناہ اگرچہ نبود اختیار ما حافظ تو در طریقِ ادب کوش و گو گناہ من است

اے حافظ اگرچہ گناہ ہمارے اختیار کی بات نہیں ہی لیکن تو از روئے ادب یہی کہہ کہ میں نے ہی گناہ کیا

علاوہ بریں معتزلہ خدا کی رویت کے قائل نہیں ہیں اور خواجہ کہتے ہیں ؎

ایں جانِ عاریت کہ بحافظ سپرد دوست روزے رخش ببینم و تسلیم وے کنم

یہ جانِ مستعار جو دوست نے میرے سپرد کی ہی ایکدن میں اسکے چہرے کو دیکھونگا اور اسے واپس کر دونگا

اس شعر سے ثابت ہو گیا کہ وہ اشعری ہیں نہ کہ معتزلی

وفات کے دو سو برس بعد تک ان کے معتزلی اور اشعری ہونے کا جھگڑا رہا بعد ازاں قاضی نور اللہ صاحب شوستری نے اپنی کتاب مجالس المومنین میں جہاں تمام بڑے بڑے سنیوں حتیٰ کہ ہارون الرشید خلیفہ عباسی اور شیخ سعدیؒ کو بھی اہل تشیع میں داخل کیا ہی وہاں خواجہ کو بھی اسی فہرست میں درج کیا ہی اور ثبوت میں یہ غزل نقل کی ہی

جوزا سحر نہاد حمائل برابرم یعنی غلام شاہم و سوگند میخورم

اس غزل میں خواجہ نے منصور کی مدح کی ہی اس کے آخر کے اس شعر سے

حافظ ز جاں محب رسول ست و آل او بر ایں سخن گواست خداوند اکبرم

حافظ جان سے رسول کو اور ان کی اولاد کو دوست رکھتا ہی اس بات پر خداوند عالم گواہ ہے۔

قاضی صاحب خواجہ کو شیعہ کہتے ہیں۔ مگر اس سے ان کا شیعہ ہونا ثابت نہیں

ہوتا کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے اولاد کی محبت تو ہر سنی بھی رکھتا ہے۔
معلوم ہوتا ہے کہ قاضی صاحب کے زمانہ تک وہ تمام غزلیں قصیدے اور رباعیاں وغیرہ جن سے صاف صاف خواجہ کا شیعہ ہونا ثابت ہوتا ہے دیوان میں داخل نہیں کیگئی تھیں ورنہ قاضی صاحب ان کو ضرور لکھتے۔
یہ مقطع بھی ایک قلمی دیوان میں جو ۹۸۱ھ کا لکھا ہوا ہے۔ اس طرح ہے۔

حافظ بجان دعائے تو گوید بصبح و شام
برایں سخن گواست خداوند اکبرم

سلسلۂ کلام کے لحاظ سے یہی ٹھیک معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ یہاں رسول اور آل رسول کے ذکر کا کوئی موقع نہ تھا۔
ایک بات یہ بھی ہے کہ اہل تشیع کے یہاں جنازہ کی نماز میں پانچ تکبیریں ہوتی ہیں اور خواجہ فرماتے ہیں ؎

من ہماں دم کہ وضو ساختم از چشمۂ عشق
چار تکبیر زدم یکسر برہر چہ کہ ہست

میں نے جس وقت عشق کے چشمہ سے وضو کیا اسی وقت تمام چیزوں پر چار تکبیریں (نماز جنازہ) پڑھ دیں

شیعوں کی طرف سے خود خواجہ پر دو اعتراض کیے گئے ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ کہتے ہیں

بہ بیں ہلال محرم بخواہ ساغر راح
کہ ماہ امن و امانست و سال صلح و صلاح

محرم کا ہلال دیکھو اور شراب کا پیالہ پیو کیونکہ امن و امان کا مہینہ اور بہتری اور بہبودی کا سال ہے

شیعوں کے نزدیک محرم کا مہینہ سوگ اور ماتم کا مہینہ ہے۔ کیونکہ امام حسین علیہ السلام اس میں قتل ہوئے ہیں اور وہ محرم کا ہلال دیکھتے ہی جام شراب طلب کرتے ہیں اور خوشی کرتے ہیں۔
دوسرا یہ کہ لوگ تبرکاً و تیمناً اپنی کتاب کو اللہ اور رسول کی تعریف یا قرآن کی

کسی آیت سے شروع کرتے ہیں اور خواجہ نے اپنے دیوان کو یزید کے مصرع سے شروع کیا ہے۔ اس کا شعر یہ ہے۔

انا المسموم ما عندی بتریاق ولا راقی ادر کاساً وناولہا الا یا ایہا الساقی

مجھکو زہر دیا گیا ہے نہ میرے پاس تریاق ہے نہ منتر پڑھنے والا ہے اے ساقی ساغر کا دور چلا اور پیالہ عنایت کر

خواجہ نے اس کے دوسرے مصرع میں ذرا سا تغیر تبدل کر کے اسی سے اپنا دیوان شروع کیا ہے۔

الا یا ایہا الساقی ادر کاساً وناولہا کہ عشق آسان نمود اول ولے افتاد مشکلہا

اہلی شیرازی نے گو کہ خواجہ کی طرف سے معذرت کی ہے اور یہ قطعہ لکھا ہے کہ

خواجہ حافظ را شبے دیدم بخواب گفتم اے در فضل و دانش بے مثال

از چہ بستی بر خود این شعر یزید با وجود این ہمہ فضل و کمال

گفت واقف نیستی زین مسئلہ مال کافر ہست بر مومن حلال

لیکن کاتبی نیشاپوری راضی نہیں ہوتا وہ کہتا ہے کہ ایک شاعر کے لیے یہ ننگ ہے کہ کوئی کتا منہ میں نوالہ لیے ہوئے جا رہا ہو اور وہ اس کو چھین لے۔ چنانچہ اس نے لکھا ہے۔

عجب در حیرتم از خواجہ حافظ بنوعے کش خردزاں عاجز آید

چہ حکمت دید در شعر یزید او کہ در دیوان نخست از وے سراید

اگرچہ مال کافر بر مسلماں حلالست در در قوے نشاید

ولے از شیر عیبے بس بزرگست کہ لقمہ از دہان سگ رباید

ہم اس معاملہ میں حیران تھے کہ خواجہ کو کس فرقہ میں شمار کریں۔ معتزلی کہتے ہیں تو سنی خفا ہوتے ہیں، سنی کہتے ہیں تو شیعہ رنجیدہ ہوتے ہیں۔ آخر خود ہم نے خواجہ

سے سوال کیا کہ بتایئے آپ کس فرقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ آزاد منش خواجہ نے جواب دیا

جنگِ ہفتاد و دو ملت ہمہ را عذر بنہ　　چوں ندیدند حقیقت رہِ افسانہ زدند

حقیقت یہ ہے کہ خواجہ ایک درویش کامل اور صوفی باصفا تھے۔ وہ اس تفرقہ کے جال سے جو ظاہری تقلید سے پیدا ہوتے ہیں بالکل آزاد تھے۔ وہ مذہب کی وسعت کو سمجھتے تھے اور سچے مسلمان تھے۔ ان کا درجہ فرقہ بندی کی دسترس سے بہت بلند تھا ؂

بروایں دام بر مرغِ دگر نہ　　کہ عنقا را بلند ست آشیانہ

ذاتی حالات

خواجہ کی زندگی درویشانہ اور فقیرانہ زندگی تھی۔ ان کے تمام اوقات علمی مشاغل عبادت اور ریاضت میں صرف ہوتے تھے۔ سیر چشمی اور فیاضی جو بزرگوں کا خاصہ ہے۔ ان میں بدرجہ کمال موجود تھی۔ اور دنیاوی جاہ و مال کی خواہش سے ان کا رتبہ بہت بلند تھا ان کی تمام آمدنی فقرا اور درویشوں کے لیے وقف تھی اور بیگانہ اور آشنا سب کے لیے ان کا دروازہ کھلا رہتا تھا ؂

ہر کہ خواہد گو بیا و ہر کہ خواہد گو برو　　گیر و دارِ حاجب و دربان دریں درگاہ نیست

ان کی روزی بادشاہوں اور امرا کی فیاضی پر منحصر نہ تھی بلکہ وہ مدرسہ میں تعلیم دیتے تھے اور اُس کی آمدنی سے گذارہ کرتے تھے۔ ان کی ایک بہن چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑ مری تھی اُن کی پرورش بھی انہیں کے ذمہ تھی۔

وہ مجذوب یا صوفی یا آزاد مجرد نہ تھے۔ انھوں نے شادی بھی کی تھی اور ان کے

دو بیٹے تھے ایک بیٹا نو عمری کی حالت میں مر گیا۔ اس کے مرثیہ میں ایک غزل لکھی جسکے چند شعر یہ ہیں۔

بلبلے خونِ جگر خورد و گلے حاصل کرد | بادِ غیرت بصدش خار پریشاں دل کرد
طوطئے را بخیالِ شکرے دل خوش بود | ناگہش سیلِ فنا نقشِ امل باطل کرد
آہ فریاد کہ از چشم حسود مہ و مہر | در لحد گاہ کماں ابروئے من منزل کرد

بیان کیا جاتا ہی کہ خواجہ کی اہلیہ بھی جو ایک نیک سیرت اور حسین و جمیل بیوی تھیں عین شباب ہی کے زمانہ میں انتقال فرما گئیں۔ خواجہ کو ان کی موت سے ایسا صدمہ ہوا کہ پھر دوسرا نکاح نہیں کیا۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ غزل انہیں کے مرثیہ میں لکھی ہو۔

آں یار کز و خانۂ ما جائے پری بود | سر تا بقدم چوں پری از عیب بری بود
از چنگِ منش اختر بد مہر بدر کرد | آرے چہ کنم آفتِ دور قمری بود

دوسرے بیٹے کا نام شاہ نعمان تھا وہ ہندوستان میں آئے تھے۔ برہان پور میں اُنھوں نے انتقال کیا۔ ان کی قبر بھی وہیں قلعہ آسیر کے قریب ہو۔

حب وطن

وطن کی محبت کم و بیش ہر شخص میں ہوتی ہو لیکن شعرائے اندر جن کا احساس عام لوگوں سے زیادہ تیز اور لطیف ہوتا ہی خصوصیت کے ساتھ یہ جذبہ پایا جاتا ہی خواجہ کے جس طرح تمام شاعرانہ جذبات نہایت بلند تھے۔ اسی طرح حُبِ وطن کا بھی جذبہ ان میں بہت بلند تھا۔

وطن بھی کیسا وطن۔ شیراز جیسا مینوسواد۔ عروس البلاد وطن جہاں کی آب و ہوا نہ زیادہ گرم ہی نہ سرد ہی۔ بلکہ نہایت معتدل اور خوشگوار ہی۔ اور جو صدیوں تک شاہانِ فارس کا پایہ تخت رہا ہی۔ جس کی خاک سے سینکڑوں بڑے بڑے نامور علما، فضلا اور اہل کمال پیدا ہوئے جن کے کارنامے اور تصنیفیں اب تک مسلمانوں کے لیے مایۂ ناز ہیں۔ اکثر شاعروں نے شیراز کی تعریف میں اشعار اور قصیدے لکھے ہیں۔ شیخ سعدیؒ نے بھی اس شہر کی اور یہاں کے باشندوں کی مدح کی ہی۔ لیکن حقیقت یہ ہی کہ شیراز کو ہر دلعزیز بنانیوالے وہی چند اشعار ہیں جو خواجہ نے اس کی تعریف میں لکھدیئے ہیں۔ سعدی کہتے ہیں ؎

خاک شیراز و آب رکنا باد دست از دامنم نمی دارد

شیراز کی خاک اور رکنا باد کا چشمہ دونوں میرا دامن نہیں چھوڑتے ہیں۔

خواجہ فرماتے ہیں ؎

نسیم باغ مصلّےٰ و آب رکنا باد نمی دہند اجازت مرا بسیر و سفر

باغ مصلّےٰ کی نسیم اور رکنا باد کا چشمہ دونوں مجھے کہیں آنے جانے کی اجازت نہیں دیتے

خواجہ کو اپنے دلفریب وطن اور اس کی پُرفضا سیر گاہوں سے اس قدر محبت تھی کہ وہ کہیں دوسری جگہ آنا جانا پسند نہیں کرتے تھے ایک دفعہ یزد والوں کے بڑے اصرار سے وہاں تشریف لے گئے۔ شیراز کی یاد میں کیسا آٹھ آٹھ آنسو روتے ہیں۔

نمازِ شام غریباں چو مویہ آغازم بنالہائے غریبانہ قصہ پردازم
بیاد یار و دیار آنچناں بگریم زار کہ از جہاں رہ و رسم سفر براندازم
ہوائے منزلِ جاناں چو آبِ زندگی است صبا بیار نسیمے ز خاک شیرازم

انھوں نے شیراز کی تعریف میں یہ غزل بھی لکھی ہے جو "غزل شیرازی" کے نام سے مشہور ہے۔

خوشا شیراز و وضع بے مثالش	خداوندا نگہدار از زوالش
ز رکنا باد ما صد لوحش اللہ	کہ عمر خضر مے بخشد زلالش
میان جعفر آباد و مصلےٰ	عبیر آمیز مے آید شمالش
بشیراز آے و فیض روح قدسی	بجواز مردم صاحب کمالش
کہ نام قند مصری برد آنجا	کہ شیرینان نداوند انفعالش
صبا زاں لولی شنگول سرمست	چہ داری آگہی چونست حالش
مکن بیدار ازیں خوابم خدا را	کہ دارم عشرتے خوش با خیالش

چرا حافظ چو میترسیدی از ہجر
نکردی شکر ایام وصالش

شیراز کے مشرقی سمت میں دو میل کے فاصلہ پر ایک مسطح اور خوشنما مرغزار ہے جس کا نام خاک مصلےٰ ہے۔ اس میں ہمیشہ قدرتی سبزہ کا فرش بچھا رہتا ہے اور بہار کے زمانہ میں رنگ برنگ کے خود رو پھول اس کثرت سے کھل جاتے ہیں کہ تمام میدان گلزار بنجاتا ہے۔ اسی میں نہر رکنی یا رکنا باد[۱] جاری ہے۔ جو رکن الدولہ دیلمی نے نکالی تھی اور جس کا پانی نہایت صاف شفاف اور شیریں ہے۔ خواجہ اس کی مدح میں کہتے ہیں ؎

بدہ ساقی مئے باقی کہ در جنت نخواہی یافت	کنار آب رکنا باد و گل گشت مصلےٰ را

[۱] اب اس نہر کا برائے نام نشان باقی ہے۔

اس نہر کے منبع کا نام "اللہ اکبر" ہے خواجہ نے ایک غزل میں لکھا ہے ؎

فرق است ز آب خضر کہ ظلمات جائے اوست　　تا آب ما کہ منبعش اللہ اکبر است

خضر کے چشمہ آب حیات میں کہ ظلمات میں ہے اور ہمارے اس چشمہ میں جس کا منبع اللہ اکبر ہے بڑا فرق ہے

شیراز کی اکثر سیرگاہیں اور باغات بھی اسی جانب واقع ہیں اور یہ قطعہ زمین ایک نہایت پر فضا مقام ہے خواجہ کی طبیعت چونکہ فطرتاً شاعرانہ تھی اس لیے وہ قدرتی مناظر دلفریب اور پر فضا مقامات کو جہاں کسی قدر تنہائی بھی ہو زیادہ پسند کرتے تھے۔ اسی وجہ سے خاک مصلٰے ان کو بہت پیاری تھی۔ اکثر اپنے فرصت کے اوقات میں وہیں چلے جاتے تھے اور دل بہلاتے تھے۔

تمام دنیا پر اس کو ترجیح دیتے ہیں کہتے ہیں ؎

شیراز و آب رکنی و این باغ خوش نسیم　　عیبش مکن کہ خال رخ ہفت کشور است

شیراز اور چشمہ رکنی اور اس پر فضا باغ کو برا نہ کہو کیونکہ یہ تمام دنیا کے چہرہ کا تل ہے۔

وفات

تقریباً ۷۰ سال کی عمر میں عشا کے وقت دوشنبہ کے دن تاریخ ۱۷۔ ذوالحجہ ۷۹۱ھ میں خواجہ نے شیراز ہی میں وفات پائی جنازہ پر خلقت خدا کا بڑا ہجوم تھا۔ شہر کے تمام امرا اور رؤسا حتی کہ منصور بن مظفر بادشاہ وقت بھی شریک تھا۔ خواجہ کو چونکہ خاک مصلٰے سے اپنی زندگی میں بہت الفت تھی اس لیے لوگوں کی یہ رائے ہوئی کہ اسی مقام میں ان کو دفن کرنا چاہیے۔ ع

قبر بلبل کی بنے گلزار میں

چنانچہ اسی میں وہ ایک شمشاد کے درخت کے نیچے جس کو اُنھوں نے خود لگایا تھا، دفن کیے گئے۔ لطف یہ ہے کہ "خاک مصلّٰی" ہی سے ان کی وفات کی تاریخ بھی نکل آئی۔ اسی زمانہ کے کسی شاعر نے جس کا نام نہ معلوم ہو سکا اس کو نظم کر کے اس طرح قطعۂ تاریخ بنا دیا۔

چراغ اہل معنی خواجہ حافظ　　　که شمعے بود از نور تجلّی

چو در خاک مصلّی ساخت منزل　　　بجو تاریخش از خاک مصلّی ۷۹۱ھ

خواجہ کا مزار خاک مصلّٰی کے جس حصہ میں ہے وہ انہیں کے نام سے حافظیہ کہلاتا ہے اس سے دو سو گز فاصلہ پر مغرب کی طرف مسجد مصلّٰی ہے۔

خواجہ کی قبر جیسا کہ اُنھوں نے خود کہا تھا۔

بر سر تربت ما چون گذری همت خواہ　　　که زیارت گہ رندان جهان خواهد بود

ہماری قبر پر جب تمہارا گذر ہو تو دعا مانگو کیونکہ ہماری قبر دنیا بھر کے رندوں کی زیارت گاہ ہوگی

ایک مشہور زیارت گاہ ہے۔ دور دور سے لوگ خاصکر فقرا اور درویش اس کی زیارت کے لیے آتے ہیں۔ اور حلقۂ دور میں ایک جام ان کے نام کا سپرد خاک کرتے ہیں۔ ۸۹۵ھ میں جب سلطان ابو القاسم بابر بہادر نے شیراز پر قبضہ کیا تو مولانا محمدؐ معمائی نے جو سلطان مذکور کے وزیر تھے خواجہ کی قبر پر ایک خوشنما گنبد بنوا دیا کریم خاں زند نے اپنے عہد حکومت میں باغ مصلّٰی کو جس میں نہر رکنی جاری ہے درست کرایا اور وہاں درویشوں کے رہنے کے لیے ایک خانقاہ بھی بنوا دی تربت پر سنگ مرمر کا ایک خوبصورت تختہ لگوا کر نہایت خوشنما نستعلیق خط میں بیچ میں یہ غزل کندہ کرائی۔

مژدهٔ وصل تو کو کز سر جان برخیزم　　　طائر قدسم و از دام جهان برخیزم

یارب از ابرِ ہدایت برسان بارانے | پیشتر زانکہ چو گردے ز میاں برخیزم
بولائے تو کہ گر بندۂ خویشم خوانی | از سرِ خواجگی کون و مکاں برخیزم
بر سرِ تربتِ من مے و مطرب بنشیں | تا بہ بوییت ز لحد رقص کناں برخیزم
گرچہ پیرم تو شبے تنگ در آغوشم گیر | تا سحر گہ ز کنارِ تو جواں برخیزم
تو مپندار کہ از خاک سرِ کوئے تو من | بجفائے فلک و جورِ زماں برخیزم

سرو بالا بنما اے بتِ شیریں حرکات
کہ چو حافظ ز سرِ جان جہاں برخیزم

حاشیہ پر یہ غزل کندہ ہے۔

اے دل غلامِ شاہ جہاں باش و شاہ باش | پیوستہ در حمایتِ لطفِ الٰہ باش
از خارجی ہزار بیک جو نمے خرند | گو کوہ تا بکوہ منافق سپاہ باش
چوں احمدم شفیع بود روز رستخیز | گو ایں تنِ بلاکشِ ما پر گناہ باش
امروز زندہ ام بولائے تو یا علیؓ | فردا بروحِ پاکِ اماماں گواہ باش
آنرا کہ دوستی علیؓ نیست کافرست | گو زاہدِ زمانہ و گو شیخِ راہ باش
مردِ خدا کہ زاہد و تقوے طلب بود | خواہی سفید جامہ و خواہی سیاہ باش
قبرِ امامِ ہشتم سلطانِ دیں رضا | از جاں ببوس و بر درِ آں بارگاہ باش
دستت نمی رسد کہ بچینی گلے ز باغ | بارے بپائے گلبنِ ایشاں گیاہ باش

حافظ طریقِ بندگیِ شاہ پیشہ کن
وانگاہ در طریق چو مردانِ راہ باش

لیکن یہ غزل خواجہ کی نہیں ہے۔ کریم خاں زند نے کسی سے تصنیف کرا کے لکھوائی ہے

کیونکہ بارہویں صدی سے پہلے یعنی کریم خاں زند کے پیشتر کے دیوان حافظ کے نسخوں میں نہیں پائی جاتی۔ ہمارے پاس اس وقت چار نسخے ہیں۔ ایک سنہ ۹۵۲ھ کا لکھا ہوا ہی۔ دوسرا سنہ ۹۸۱ھ کا تیسرا سنہ ۱۰۹۳ھ کا چوتھا سنہ ۱۲۰۸ھ کا ان میں سے پہلے تینوں نسخوں میں نہیں ہی صرف چوتھے میں ہی۔ مولانا سودی کے نسخہ (جس کا ذکر آگے آئیگا) میں بھی نہیں ہی بلکہ لکھا ہی کہ "تعلیم یافتہ ترکوں نے عام طور پر مجھ سے کہا کہ یہ غزل کسی غیر شخص نے لکھکر دیوان میں داخل کر دی ہی۔
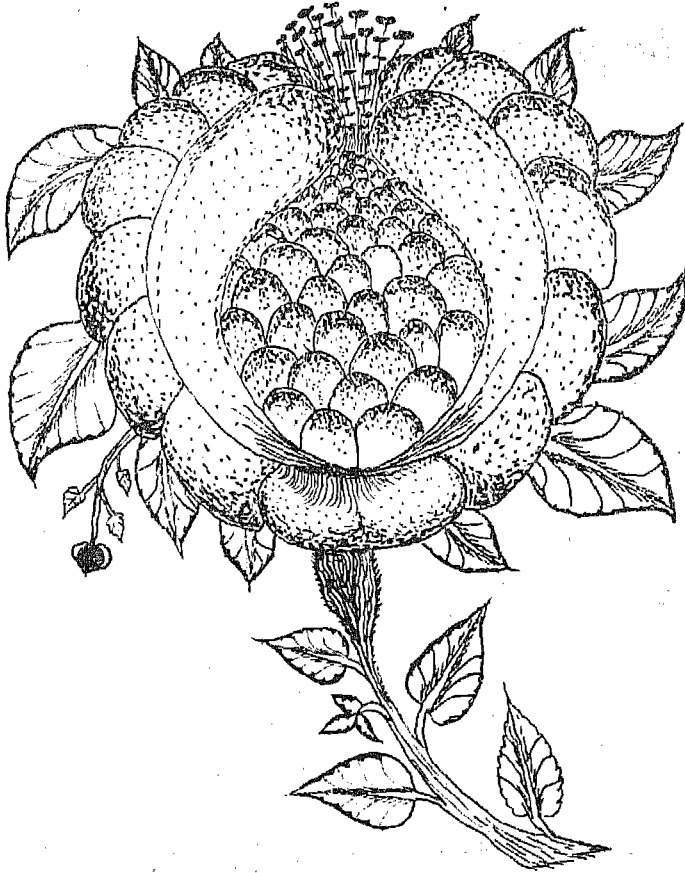
تصنیفات

تذکروں سے معلوم ہوتا ہی کہ خواجہ نے تفسیر کشاف پر ایک حاشیہ لکھا تھا۔ ہم نے اُس کو بہت تلاش کیا مگر افسوس ہی کہ نہیں مل سکا۔ کشف الظنون اور اکسیر میں جہاں ان کتابوں کی فہرست درج ہی جو علوم قرآنیہ کے متعلق لکھی گئی ہیں وہاں تفسیر کشاف کے حاشیوں شرحوں اور خلاصوں کو بھی نام بنام لکھا ہی۔ ان میں خواجہ کے حاشیہ کا ذکر نہیں ہی یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ خواجہ نے حاشیہ ہی نہیں لکھا کیونکہ شیراز کے علما نے اور خاصکر اسی صدی کے علما نے جس میں خواجہ موجود تھے کشاف کے متعلق کتابیں لکھی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہی کہ یہ تفسیر وہاں کے علمائے حلقہ میں دلچسپی کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھی۔ پھر خواجہ نے جو تفسیر ہی پڑھاتے تھے اور اس فن سے خاص ذوق رکھتے تھے کچھ عجب نہیں کہ اس تفسیر پر جو اُن کو بہت پسند تھی حاشیہ لکھا ہو وہ خود کہتے ہیں۔

زحافظانِ جہاں کس چو بندہ جمع کرد لطائف حکما با کتاب قرآنی

دنیا بھر کے حافظوں میں سے میری طرح کسی نے بھی فلسفیوں کے اقوال کو قرآن کے ساتھ مطابق نہ کیا

مگر چونکہ سہل پسند طبیعتوں نے خود کشاف ہی کو جو ایک دقیق کتاب ہی ترک کر دیا تو اس کے حواشی اور شروح کی طرف ان سے توجہ کرنے کی کیا توقع ہو سکتی تھی اسلیے یہ قیاس کرنا غالباً صحیح ہوگا کہ خواجہ کا حاشیہ بھی منجملہ اور تصانیف کے علمی بے اعتنائی کا شکار ہو گیا ان کی اس وقت جو یادگار ہی وہ دیوان ہی۔

خواجہ اپنے علمی مشاغل اور صوفیانہ ریاضتوں کی وجہ سے اپنے کلام کو جو اُن کی طبیعت کا ایک ادنی کرشمہ تھا کوئی بڑا کارنامہ نہیں سمجھتے تھے۔ چنانچہ اپنی زندگی میں

اُنھوں نے اسکے جمع کرنے کی طرف بھی توجہ نہیں کی۔ ان کی وفات کے بعد محمدؐ گلندام نے جو ان کے معتقدوں میں سے تھے دیوان کو مرتب کیا۔ وہ دیباچہ میں لکھتے ہیں
"قرآن کی تعلیم بادشاہ کی ملازمت۔ کشاف اور مصباح پر حاشیہ لکھنے۔ مطالع اور مفتاح کے مطالعہ۔ علم ادب کی تحصیل اور شعراء عرب کے دواوین کی جستجو میں وہ ایسے مصروف رہے کہ اپنے اشعار اور غزلوں کو جمع نہیں کر سکے"
دیوان کی ترتیب اسی اصول پر ہے جس اصول پر دیگر شعراء فارس کے دواوین کی ہے حروف تہجی کے سلسلہ کے مطابق الف سے ے تک ردیف وار غزلیں درج کی گئی ہیں البتہ پ چ ژ ذ اور گ کی ردیف پر کوئی غزل نہیں ہے۔
سب سے زیادہ جو امر افسوسناک ہے وہ یہ ہے کہ خواجہ کے کلام میں دوسروں کا کلام خلط ملط کر دیا گیا ہے۔ اور بہت سی غزلیں اور قصیدے غیروں کے اس میں داخل کر دیئے گئے ہیں۔ جس کے بہت سے اسباب ہیں۔
ایک بڑا سبب تو یہ ہے کہ بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اپنے خیالات کو لوگوں میں پھیلانا چاہتے ہیں۔ لیکن ان کی حیثیت اور عزت لوگوں میں اس قدر نہیں ہوتی کہ ان کے خیالات کی وقعت ہو اس لیے وہ کسی بڑے آدمی کے نام کی طرف اُن کو منسوب کر دیتے ہیں۔ تاکہ لوگ وقعت کی نگاہ سے دیکھیں۔ حضرت علیؓ کے کہے ہوئے بہت تھوڑے سے اشعار ہوں گے لیکن ان کے نام سے سینکڑوں آدمیوں نے اپنے اپنے خیالات عوام میں پھیلانے کی کوشش کی۔ چنانچہ ان کی وفات کے کئی صدی کے بعد ان کے نام سے پورا دیوان تیار کر لیا گیا۔ اسی طرح حافظ کے نام سے بھی بہت سی غزلیں اور رباعیاں گھڑ کر لوگوں نے ان کے دیوان میں داخل کر دیں۔ دوسرے

شعرا کا بھی جو کلام ان کو پسند آیا اس کو بھی اُنھوں نے حافظ کا قرار دیدیا۔ رضا قلی لکھتا ہی کہ سلمان ساوجی متوفی ۷۷۸ھ جو بغداد کے ایلکانی دربار کا بڑا معزز شاعر تھا۔ اس کا بھی کچھ کلام لوگوں نے اس کے دیوان سے خواجہ کے دیوان میں شامل کر دیا ہی۔

دوسرا سبب یہ ہی کہ سلطان مرزا شاہرخ کے درباریوں میں ایک حافظ حلوائی تھا۔ جو حافظ شیرازی کے رنگ میں کہتا تھا۔ اس کا شعر ہی۔

حافظ حلوائیم و در کمال　　　معتقدِ حافظ شیرازیم

بعض لوگوں نے غلط فہمی سے اس کے بعض قصیدے اور غزلیں خواجہ کے سمجھکر ان کے دیوان میں داخل کر دیئے۔

تیسرا سبب یہ ہی کہ بعض لوگوں نے خواجہ کو شیعہ کہنے کے لئے ان کے دیوان میں ایسا کلام ملحق کیا جس سے ثابت ہو کہ وہ شیعہ تھے۔ جہانتک میں سمجھتا ہوں اس قسم کی غزلیں اور قصیدے اہلی شیرازی[1] یا اس کے کسی ہمعصر کی تصنیف سے ہیں۔

الحاق کرنے والوں نے بھی غضب کیا ہی عمر خیام کی بہت سی رباعیاں نقل کر لی ہیں اور تو اور شیخ سعدیؒ کے دیوان کے بیسیوں مشہور اشعار خواجہ کے دیوان میں داخل کر دیئے ہیں مثلاً

بازآکہ در فراقِ تو چشم امیدوار　　　چوں گوش روزہ دار بر اللہ اکبر ست

خیال روے کسے در سرست ہر کس را　　　مرا خیال کسے کز خیال بیرون ست

گنج آزادگی و کنج قناعت ملکے ست　　　کہ بہ شمشیر میسر نشود سلطاں را

[1] اہلی شیرازی شاہ اسمٰعیل صفوی کے درباری شعرا میں سے تھا ۹۴۲ھ میں وفات پائی۔ خواجہ حافظ کے مقبرہ میں مدفون ہوا ایک دیوان اور مثنوی سحر حلال یادگار ہی۔

مندرجہ ذیل پوری غزل شیخ کی بہ تبدیل تخلص دیوان حافظ کے ان نسخوں میں جو بمبئی یا کانپور وغیرہ میں چھپے ہیں شامل کی گئی ہے۔

برخیز تا طریق تکلف رہا کنیم | دکانِ معرفت بدو جو پر بہا کنیم
گر دیگر آن نگار قبا پوش بگذرد | ما نیز جامہاے تصوف قبا کنیم
ہفتاد زلت از نظر خلق در حجاب | بہتر ز طاعتے کہ برئے وریا کنیم
آن کو بغیر سابقہ چندین نواخت کرد | ممکن بود کہ عفو کند گر خطا کنیم

سعدی وفا نمیکند ایام سست عہد
این پنجروزہ عمر بیا تا وفا کنیم

لاہور کے چھپے ہوئے اور نیز دیوان حافظ کے دوسرے نسخوں میں بھی شیخ کا یہ مشہور شعر جس کو گلستاں پڑھنے والے بچے بھی جانتے ہیں۔ موجود ہے۔

یا مکن با پیل باناں دوستی | یا بنا کن خانۂ درخورد پیل

اس سے زیادہ بدیہی مثال الحاق کی اور کیا ہوگی۔

دیوان کا ایک نسخہ اُٹھا لیجے اور دوسرے نسخے سے ملا کر دیکھیے سینکڑوں اشعار کا فرق نظر آئیگا۔ غزلیات کی ترتیب ایک نسخہ کی اور ہے دوسرے کی اور۔ ایک میں اگر چار سو غزلیں ہیں۔ تو دوسرے میں پانچسو۔ سو غزلوں کا فرق پڑ جاتا ہے۔

شکر ہے کہ سب سے پہلے گیارہویں صدی ہجری کے ابتدا میں ایک ترک عالم مولانا سودی رح نے جو بوسینا کے باشندے تھے دیوان کو غالباً ویانا میں طبع کرایا اسکی نقل دوبارہ اور سہ بارہ لیپزک اور ویانا میں طبع ہوئی کچھ زمانہ ہوا قسطنطنیہ میں بھی چھاپی گئی ہے۔

مولانا سودی نے نویں اور دسویں صدی ہجری کے دیوان کے بہت سے قلمی نسخے جمع کیئے ان کا مقابلہ کر کے نہایت تصحیح کے ساتھ طبع کرایا۔ ہمارے پاس جو قلمی نسخہ دیوان کا ۹۵۲ھ کا لکھا ہوا ہے۔ اس کو مولانا سودی کے نسخے سے ملا کر ہم نے دیکھا سوائے غزلوں کی ترتیب کے کچھ زیادہ فرق نہیں پایا۔

عام بازاری نسخوں سے مولانا سودی کے نسخہ میں ۶۰-۷۰ غزلیں کم ہیں۔

بمبئی کے مطبع فتح الکریم کے چھپے ہوئے نسخے میں ۵۹۲ غزلیں ہیں مسٹر جیرٹ کے نسخے میں ۵۷۳ اور مولانا سودی کے نسخے میں ۵۲۸ علاوہ بریں ۲۰۱ شعر جو مختلف غزلوں میں داخل کر دیئے گئے ہیں۔ مولانا سودی کے نسخہ میں نہیں ہیں

قصیدوں کی کیفیت یہ ہے کہ مطبوعہ نسخوں میں سے کسی میں کوئی قصیدہ نہیں ہے کسی میں چار ہیں کسی میں پانچ۔ ہمارے ۹۵۲ھ کے نسخے میں ایک بھی نہیں ہے ۱۲۰۸ھ کے نسخہ میں سات ہیں۔

مگر عام طور پر قلمی نسخوں میں کوئی قصیدہ نہیں پایا جاتا۔

برٹش میوزیم میں دیوان کے پرانے قلمی نسخے جس قدر موجود ہیں تقریباً سب بلا قصیدہ کے ہیں۔ مثلاً ابو الفتح شیخ محمد بنی اسرائیل ساکن کول کا لکھا ہوا نسخہ جمادی الاول ۱۰۲۰ھ کا بلا قصیدہ کے ہے۔ سلیمان الفوشنجی کے نسخہ میں بھی کوئی قصیدہ نہیں ہے۔ عبد الرشید بن مولانا عبد اللطیف ترکان دہلوی کا نسخہ جو ۱۰۵۳ھ کا لکھا ہوا ہے بلا قصیدہ کے ہے۔

عبد اللہ تبریزی کے نسخہ میں بھی کوئی قصیدہ نہیں ہے۔

بانکی پور کے کتب خانہ کی قلمی کتابوں کی فہرست جو انگریزی میں مولوی عبد المقتدر خاں صاحب نے مرتب کی ہے اور سال گزشتہ میں کلکتہ سے شائع ہوئی ہے۔ اس میں

اُنھوں نے دیوان کے کئی قلمی نسخوں کا پتہ دیا ہی۔ ان میں سے اکثر میں صرف یہ ایک قصیدہ ہے۔

جوز اسحر نہاد حمائل برابرم   یعنی غلام شاہم و سوگند میخورم

مسٹر برچ کے سکرٹری نے سنہ ۱۸۲۱ء میں جو نسخہ اس دیوان سے نقل کیا ہی۔ جو خواجہ کے مزار پر رکھا رہتا ہی اور جو انڈیا آفس لائبریری میں موجود ہی اس میں بھی صرف یہی ایک قصیدہ ہی۔ قاضی نور اللہ صاحب نے اس قصیدے کو بھی غزل لکھا ہی۔ اور ہمارے پُرانے نسخہ میں اس کا نہ غزلیات میں پتہ ہی نہ قصائد میں۔ ترکیب بند کا کسی پرانے نسخہ میں پتہ نہیں ہی۔ ہم خود حیرت میں ہیں کہ یہ ترکیب بند شاہ ناصر الدین کی مدح میں لکھا گیا ہی اور اس صدی میں تمام فارس میں ناصر الدین نام کا کوئی بادشاہ ہم کو نہیں ملتا پھر یہ خواجہ کا کیسے ہوسکتا ہی ترجیع بند بھی پُرانے نسخہ میں نہیں ہی نہ مغنی نامہ ہی نہ ساقی نامہ ہی۔

رباعیات قلمی نسخوں میں سے کسی میں بیس ہیں کسی میں پچیس ہیں ہمارے پرانے نسخہ میں ۲۷ ہیں بمبئی اور لکھنؤ کے چھپے ہوئے نسخوں میں ۷۵ تک ان کی تعداد پہنچ گئی ہے۔

سنہ ۱۹۰۷ء میں مطبع نامی لکھنؤ نے دیوان کو اور بھی ملحقات سے بھر دیا اس مطبع میں پہلے جو نسخہ چھپا تھا اس میں ۶۱۲۳ اشعار تھے سید جلال الدین اندرابی نے جو غالباً اس مطبع سے کچھ تعلق رکھتے ہیں ایک شعر کسی کا دیکھا جس میں دیوان حافظ کے اشعار کی تعداد آٹھ ہزار بتائی گئی ہی۔ اس سے ان کو یہ شوق ہوا کہ آٹھ ہزار اشعار دیوان کے پورے کرنے چاہئیں چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ میں نے قلمی اور غیر ملکوں کے چھپے ہوئے

۴۰ نسخے دیوان حافظ کے جمع کیے اور یہ اصول رکھا کہ کم سے کم چار نسخوں میں جو شعر ملے اس کو لے لینا چاہیے۔ چنانچہ اس طرح ۸۴ غزلیں ۹۵ رباعیاں ایک مثنا ۵۴ قطعات ایک مسدس ۱۲۴۲۔ اشعار متفرقہ اور بھی شامل کر دیئے۔ آخر میں خود لکھتے ہیں کہ ان میں سے بہت سے شعروں اور غزلوں کی نسبت ملحق ہونے کا گمان غالب تھا۔ لیکن آٹھ ہزار اشعار کی تکمیل کے شوق میں ان کو چھوڑنا مناسب نہ سمجھا۔

ہم اس شوق اور مذاق کو کیا کہیں جس کی بدولت ایک ایسی قیمتی محنت رائگاں گئی ہم مولانا سودی کے لیے دعائے خیر کرتے ہیں کہ انھوں نے حافظ کی سچی خدمت کی اور آج سے تین سو برس پہلے ان کے کلام کا قابل اعتبار اور صحیح مجموعہ چھاپکر شائع کیا۔

کلام کی اشاعت

خواجہ کا کلام چونکہ مقبول خاص و عام تھا اس وجہ سے بہت تھوڑے عرصہ میں ملکوں ملکوں پھیل گیا ہزار ہا نسخے اس کے لکھے گئے۔

چھاپہ کی ایجاد کے بعد سب سے پہلے مولانا سودی نے سترہویں صدی عیسوی کے آغاز میں اس کو چھاپکر شائع کیا۔ ترکی زبان میں اس کی ایک شرح بھی لکھی بعد ازاں پھر مختلف ملکوں میں وہ چھپا۔

اس وقت ہمارے سامنے دو فہرستیں موجود ہیں جن میں دیوان حافظ کے طبع اور اشاعت کی مختصر کیفیت لکھی ہوئی ہے۔

ایک برٹش میوزیم کی فارسی کی قلمی کتابوں کی فہرست مرتبہ چارلس ریو دوسری بانکی پور کے کتب خانہ عام کی فارسی اور عربی کی قلمی کتابوں کی فہرست مرتبہ مولوی

عبدالمقتدر صاحب ان کے علاوہ دیوان کے بیسیوں نسخے دنیا کے مختلف حصوں کے چھپے ہوئے بھی ہمارے پاس موجود ہیں اس لیے ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ اپنے علم کے مطابق دیوان کے طبع اور اشاعت کی کیفیت درج کریں۔ نیز اسکی شرحوں اور حاشیوں کی بھی فہرست لکھیں

نام مقام	سنہ اشاعت
....	سترہویں صدی کے آغاز میں مولانا سودی کا نسخہ
لندن	سنہ ١٧٩١ء۔ حافظ کے مختصر حالات زندگی بھی دیباچہ کے ساتھ ہیں۔
کلکتہ	سنہ ١٧٩١ء سے سنہ ١٨٢٦ء مع حاشیہ مولوی فتح علی صاحب سنہ ١٨٥٥ء سنہ ١٨٨١ء مسٹر جیرٹ کا نسخہ
لیپزگ	سنہ ١٨٥٤ء براکھاس نے مولانا سودی کا نسخہ مع ان کی شرح کے طبع کرایا۔ نقل
ویانا	سنہ ١٨٥٨ء روزنزویگ نے معہ اپنے ترجمہ کے تین جلدوں میں شائع کیا سنہ ١٨٦٣ء مولانا سودی کے نسخہ کی
قسطنطنیہ	سنہ ١٢٥٧ھ سنہ ١٨٦٠ء۔ مع دو شرحوں کے ایک مولانا سودی کی دوسری مولانا سید محمدؐ کی
طہران	سنہ ١٢٥٨ھ
تبریز	سنہ ١٢٥٧ھ
اصفہان	سنہ ١٢٦٥ھ
مشہد	سنہ ١٢٦٤ھ
بمبئی	سنہ ١٢٢٨ھ، سنہ ١٨٤١ء، سنہ ١٨٨٣ء، سنہ ١٢٦٧ھ، سنہ ١٢٧٧ھ
بولاق (مصر)	سنہ ١٢٥٠ھ، سنہ ١٢٥٦ھ، سنہ ١٢٨١ھ
دہلی	سنہ ١٢٦٩ھ، سنہ ١٨٨٨ء
آگرہ	سنہ ١٨٦١ء
لکھنؤ	مطبع نولکشور میں سنہ ١٨٦٧ء سے سنہ ١٩٠٦ء تک ۹ مرتبہ۔ اور مطبع نامی میں سنہ ١٩٠٣ء تک، چار بار
لاہور	سنہ ١٨٨٨ء، سنہ ١٩٠٧ء
کانپور	سنہ ١٨٣١ء، سنہ ١٩٠٢ء

نام کتاب	نام مصنف	مطبوعہ یا قلمی	زبان	کیفیت
شرح دیوان حافظ	مولانا سودی	مطبوعہ قسطنطنیہ	ترکی	
"	مولانا سید محمد ابن سید حسن	" "	"	
"	مولانا شمعی	قلمی کتبخانہ سلطانی	"	
"	مصطفیٰ بیگ مصلح الدین سروری	" برٹش میوزیم		
"	شیخ محمد فضل الہ آبادی	" کتبخانہ بانکی پور	فارسی	
"	میر سیف الدین ابو الحسن عبد الرحمن ختمی	" "	"	
"	شیخ محمد دہلوی	"	"	ان شرحوں کا پتہ فارسی کی دوسری
"	مولوی سید علی صاحب	"	"	شرحوں سے لگا لیکن یہ
"	شیخ یوسف لاہوری	"	"	نہ معلوم ہو سکا کہ یہ کس کتبخانہ میں ہیں
"	مولوی صادق علی صاحب	مطبوعہ لکھنؤ	"	
شرح رضوی	مولانا کمال الدین احمد صاحب	قلمی کتبخانہ علیگڑھ کالج	"	نصف موجود ہے۔
بدر الشروح	مولانا بدر الدین اکبرآبادی	مطبوعہ دہلی	"	
حاشیہ	مولوی ہادی علی صاحب	" لکھنؤ	"	
"	مولوی فتح علی صاحب	" بمبئی وغیرہ	"	
شرح یوسفی	مولوی محمد یوسف علیشاہ چشتی	" لکھنؤ	اُردو	
ترجمہ دیوان حافظ	منشی میرزا جان صاحب	" "	"	
شتاب شتک	کرشنا چندر موزمدار	" کلکتہ	بنگالی	
ترجمہ انتخاب دیوان	....	" لاہور	پنجابی	

ان شارحوں سے ہم کو عام شکایت یہ ہے کہ انھوں نے بالکل صوفیانہ مذاق کی شرحیں لکھی ہیں ادبی خوبیاں جو خواجہ کے کلام میں ہیں ان کو ظاہر نہیں کیا ہے یہ صرف خانقاہوں میں پڑھی جانے کے قابل ہیں۔

صوفیانہ کلام میں جو خوبی ہے وہ اُسی وقت تک قائم رہتی ہے جب تک کہ مجاز اور حقیقت دونوں پر منطبق ہو۔ جب اس میں سے ایک پہلو نکال ڈالا جائے تو کوئی خوبی باقی نہیں رہتی ان شارحوں نے بھی موتی کی آب چھیلنے کی کوشش کی ہے۔ جس سے آب بھی گئی اور موتی بھی خراب ہوا۔

دوسری شکایت یہ ہے کہ آسان اور غیر ضروری باتوں کی تفصیل میں تو صفحے کے صفحے سیاہ کر دیتے ہیں لیکن تاریخی اور ادبی معلومات کا مطلق پتہ نہیں ہے جس کے بغیر پڑھنے والے کو کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔

سترہویں صدی کی ابتدا سے خواجہ کی بعض بعض غزلوں کے ترجمے یورپ کی بھی مختلف زبانوں میں نظم و نثر میں شروع ہوئے اور لوگوں نے ان کے ساتھ دلچسپی لینی شروع کی۔

اٹھارہویں صدی عیسوی میں ولیم اوسلی۔ اور وان ہیمر وغیرہ نے جرمن اور انگریزی زبانوں میں دیوان کے ترجمے شائع کیے ولیم جونس نے کئی غزلوں کے مضامین لیکر انگریزی میں گیت بنا دیئے۔ جن میں سے "اگر آں ترک شیرازی" کا گیت نہایت دلفریب اور عام پسند ہوا اور لوگ اس کو گانے لگے اس وقت سے خواجہ کے ساتھ یورپ میں ایک عام دلچسپی پیدا ہو گئی اور تمام یورپین زبانوں میں ان کے دیوان کے ترجمے شائع ہوئے۔ اور لوگوں نے ان کے متعلق کتابیں

لکھنی شروع کیں۔

دیوان کے ترجمے اور وہ تصانیف اور مضامین جو یورپ کی مختلف زبانوں میں خواجہ کے متعلق لکھے گئے ہیں۔ ان کو کون شمار کرسکتا ہے۔ ذیل میں ہم خواجہ کے کلام کے صرف اُن ترجموں کی ایک فہرست لکھتے ہیں جو انگریزی یا بعض دوسری یورپین زبانوں میں ہم کو معلوم ہوسکے۔

نام مترجم	کام کی نوعیت	اشاعت کی جگہ	اشاعت کا سنہ
مینِنسکی	دیوان کی پہلی غزل کا لاطینی نثر میں ترجمہ	وینا	سنہ ۱۶۶۰ء
ہائڈ	" " " " "	اکسفورڈ	سنہ ۱۷۶۷ء
ریوسکی	ابتدائی سولہ غزلوں کا لاطینی نثر میں	وینا	سنہ ۱۷۷۱ء
رچرڈسن	"اسپیسمین آف پرشین پوئٹری" پہلی سولہ غزلوں کا انگریزی میں	لنڈن	سنہ ۱۷۷۴ء
ولیم جونس	پورا دیوان انگریزی نثر میں	"	سنہ ۱۷۹۷ء
ولیم اوسلی	" " تین جلدوں میں	"	سنہ ۱۷۹۸ء
ولیم جونس	۵۷ غزلیں فرانسیسی نظم میں	"	سنہ ۱۷۹۹ء
ہنڈلی	۱۱ غزلیں انگریزی نظم میں	"	سنہ ۱۸۰۰ء
وان ہیمر	پورا دیوان جرمن نظم میں		سنہ ۱۸۰۱ء
ڈانر	نثر میں دو جلدوں میں " "	ہمبرگ	سنہ ۱۸۴۶ء
"	" " " " "	نوریمبرگ	سنہ ۱۸۵۲ء
روزنزویگ	متن دیوان مع ترجمہ جرمن نثر میں تین جلدوں میں	وینا	سنہ ۱۸۵۹ء
نیسل مین	انتخاب دیوان جرمن نظم میں	برلن	سنہ ۱۸۶۵ء

نام مترجم	کام کی نوعیت	مقام اشاعت	سنہ
رابن سن	نو غزلیں انگریزی نثر میں	لنڈن	سنہ ۱۸۷۳ء
بکنل	۱۲۰ غزلیں انگریزی نظم میں	"	سنہ ۱۸۷۵ء
کپتان کلارک	پورا دیوان انگریزی نثر میں دو جلدوں میں	"	سنہ ۱۸۹۱ء
جان ناٹ	۱۷ غزلیں انگریزی نظم میں	"	

اکثر انگریزی ترجمے دیکھنے میں آئے ہم نے ان کو پسند کیا مگر حقیقت یہ ہی کہ کسی زبان سے دوسری زبان میں معمولی مضامین کا ترجمہ کرنا بھی جس کو ترجمہ کہہ سکیں دشوار ہی پھر شاعری کا ترجمہ کرنا کیسے ممکن ہی۔ ترجمہ سے صرف شعر کا مفہوم ظاہر کیا جا سکتا ہی اس میں زبان کی اسلوب بیان کی الفاظ کے نشست کی جو خوبیاں ہوتی ہیں ان کا ظاہر کرنا محال ہی ہر ایک مترجم نے اس بات کا خود بھی اعتراف کیا ہی۔

انگریزی کے تمام ترجموں میں ہم کو کپتان کلارک کا ترجمہ زیادہ پسند آیا ہی وہ ساتھ ساتھ مشکل اشعار کی تشریح بھی کرتے گئے ہیں۔

میڈم لوئسا لکھتی ہی کہ حافظ کے ترجمہ میں بہ نسبت فرنچ اور انگلش کے جرمن میں زیادہ کامیابی ہوئی ہی کیونکہ اُس میں اس قسم کے شاعرانہ خیالات ترجمہ کرنے کے لیے بہت سی آسانیاں ہیں۔

خواجہ کے کلام پر ایک نظر

خواجہ کے کلام سے ہماری مراد صرف غزلیات ہیں کیونکہ ہم لکھ چکے ہیں
کہ غزلوں کے علاوہ اور جو چیزیں مثلاً قصیدے۔ ترکیب بند۔ ترجیع بند۔ مغنی نامہ
ساقی نامہ۔ وغیرہ ہیں ان سب کا صحیح نسخوں میں پتہ نہیں ہے اس لیے اگر ہم زبردستی
سے خواجہ کے سر اُن کو منڈھ دیں تو یہ حقیقت اور انصاف دونوں کے خلاف ہوگا
قطعات اور رباعیات میں الحاق اس قدر کیا گیا ہے کہ یقیناً کسی قطعہ یا رباعی
کو خواجہ کی طرف منسوب کرنا مشکل ہے اگر چند رباعیاں یا قطعے ان کے مان بھی
لیے جائیں تو ان سے ان کی شاعری کے رتبہ میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا اس لیے
ہم ان سب کو کالعدم سمجھتے ہیں۔

خواجہ غزل گوئی کے مرد میدان ہیں۔ مرد میدان ہی نہیں بلکہ بادشاہ اس لیے
ہم صرف ان کی غزل پر ایک نظر ڈالنی چاہتے ہیں۔ لیکن اس سے پہلے نفس شاعری
کے متعلق بھی کچھ کہنے کی اجازت دیجیے۔

شعر کی تعریف یہ ہے کہ جذبہ کا احساس ایسے لفظوں میں ادا کیا جائے جن سے
سننے والے کے اسی جذبہ کو ویسا ہی ہیجان ہو جیسا خود شاعر کے جذبہ کو تھا۔ شاعر
کی مثال بعینہٖ مصوّر کی ہے۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ مصوّر ظاہری اشیاء کی
تصویر کھینچتا ہے اور شاعر خیالات اور جذبات کی صورتگری کرتا ہے۔

لیکن خیالات محضہ کی صورت گری کا نام شاعری نہیں ہے جب تک ان میں
واقعیت نہ ہو یا کم سے کم واقعیت کے سانچے میں ڈھلے ہوئے نہوں۔ کیونکہ اگر یہ

دونوں باتیں نہیں ہیں یعنی نہ وہ کلام کسی واقعی جذبہ کی آواز ہی نہ اُس آواز سے مشابہ ہی تو

وہ شعر نہیں ہی۔

شاعری کسبی چیز نہیں ہی۔ شاعر اپنی شاعری خدا کے گھر سے لاتا ہی عربی میں مثل ہی۔

"الشعراء تلامیذ الرحمٰن"

ایں سعادت بزور بازو نیست　　　تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

کلمات کو اُلٹ پھیر کر موزوں کر لینا اور اسی روش کے اشعار کہہ لینا بلکہ اس سے

اچھے استعارات اور تشبیہات پیدا کر لینا جو حقیقی شعرائے کے کلام میں ہوتے ہیں آسان ہی ہر

شخص تھوڑی سی کوشش سے کر سکتا ہی۔ لیکن اس قسم کے کلام میں جو بظاہر شاعری

کے تمام فنون عروض۔ قافیہ۔ بدائع وصنائع وغیرہ سے مزین و مرصع ہوتے ہیں اور اصلی

شاعری میں وہی فرق ہی جو مصنوعی بھڑکیلے چمکیلے ناواقفوں کی نگاہوں کو دھوکا

دینے والے آبگینوں اور اصلی جواہرات میں ہوتا ہی۔

خواجہ حافظ نے خود اسی بات کو ایک شعر میں صاف طور پر کہا ہی ؎

آنرا کہ خوانی استاد گر بنگری بہ تحقیق　　　صنعتگر یست اما شعر رواں ندارد

جسکو تم استاد کہتے ہو اگر تحقیق کی نگاہ سے دیکھو تو وہ صنعتگر ہے فطری شاعر نہیں۔

شاعری تشبیہ۔ استعارہ۔ الفاظ کی نزاکت۔ لفظی رعایت۔ اور صنائع اور بدائع

کا نام نہیں ہی یہ سب چیزیں شاعری کی اضافی زیب و زینت ہیں اس کی حقیقت میں

داخل نہیں ہی۔ شاعری اسی کو کہتے ہیں کہ جذبہ کی ایسی تصویر کھینچی جائے کہ الفاظ سے

شاعرانہ جذبہ اس طرح صاف نظر آئے جیسے سفید شیشہ میں ارغوانی شراب دور

سے جھلکتی ہی۔

ارسطو نے وزن کو شاعری کا جزو قرار نہیں دیا ہو لیکن اس نے وسیع معنی میں اسکو استعمال کیا ہو حقیقت یہ ہو کہ شاعری کی دو قسمیں ہیں۔ ایک یہ کہ شاعر اپنے جذبات میں خود محو نہ ہو جائے بلکہ ان پر قابو رکھے اور دوسروں کو ان سے متاثر کرے۔ یہ شاعری کی اعلیٰ قسم ہو اس کا نام خطابت (لکچر یا اسپیچ دینا) رکھا گیا ہو۔ دوسری یہ کہ وہ اپنے جذبہ کے جوش میں وجد کرے مست ہو جائے اس کا نام شاعری ہو اس میں وزن ضروری ہو۔ کیونکہ مقفّٰی اور موزوں ہو جانے سے کلام کی تاثیر بہت بڑھ جاتی ہے۔

جذبات کا احساس کس کو نہیں ہوتا اور ہر شخص ان کو ادا بھی کرتا ہو لیکن شاعر کا احساس زیادہ نازک اور لطیف ہوتا ہو اور وہ اس کینڈے سے ادا کرتا ہے جس سے سننے والے پر اثر پڑتا ہو۔

شاعری کا اصلی راز اسلوب بیان میں مخفی ہو۔ وہی بات ایک شخص کہتا ہو کہ اس میں کوئی خوبی نہیں ہوتی۔ اسی کو جب شاعر کہتا ہو تو طبیعت وجد کرنے لگتی ہو۔

خواجہ فطرتی شاعر ہیں۔ وہ اگرچہ اپنے حقیقی جذبات کو مجازی استعاروں اور تشبیہوں میں ادا کرتے ہیں لیکن جو کچھ کہتے ہیں وہ واردات قلبی ہیں۔ یعنی "حال" ہی "قال" نہیں۔ فرماتے ہیں ؎

بلبل از فیض گل آموخت سخن ورنہ نبود　　　　این ہمہ قول و غزل تعبیہ در منقارش

بلبل نے گل کے عشق میں ترانہ ریزی سیکھی ورنہ یہ زمزمہ اور نغمہ اسکی چونچ میں جڑا ہوا نہ تھا

ایک جگہ کہتے ہیں ؎

نکتہ ناسنجیدہ گفتم دلبرا معذور دار　　　　عشوۂ فرمائے تا من طبع را موزوں کنم

میں نے بے سمجھے بات کہدی جانِ من معاف کر ایک عشوہ دکھلا دے کہ میں اپنی طبیعت کو موزوں کر لوں

الغرض خواجہ کے تمام شاعرانہ جذبات فطرتی ہیں۔ ان کا کلام شاعری کا بہترین نمونہ ہی جدت۔ جوش۔ بلندی۔ غرض جس قدر خوبیاں کلام میں ہونی چاہئیں اس میں بدرجہ کمال موجود ہیں۔ ہم ذیل میں اختصار کے ساتھ چند مثالیں ان کے کلام سے پیش کرتے ہیں۔

جدّت شعرا قلقل مینا کی آواز سنکر یا کالی کالی گھٹاؤں کو دیکھکر توبہ توڑتے ہیں حافظ کی جدّت دیکھیے

بتے چوں ماہ زانو زدہ مے چوں لعل پیش آورد ۔۔۔ تو گوئی تائبم حافظ زساقی شرم دار آخر

حسین۔ چاند جیسا حسین سامنے انداز سے دوزانو ہوکر شوخی آمیز ادب کے ساتھ بیٹھتا ہی۔ اور سرخ شراب لعل جیسی سرخ شراب پیش کرتا ہی۔ اس وقت حسن پرست میخوار جو ناصحوں کے کہنے سننے سے توبہ کر چکا ہی بے تاب ہو جاتا ہی خیالات میں کشمکش پیدا ہوتی ہی کبھی توبہ کا خیال آتا ہی۔ ناصحوں کی باتیں یاد آتی ہی کبھی اس دلفریب اور دلکش منظر کو دیکھکر خواہش جوش مارتی ہی کہ پی لے۔ آخر اپنے آپ کو اس طرح مخاطب کرکے فیصلہ کرتا ہی۔

تو گوئی تائبم حافظ زساقی شرم دار آخر

حافظ کو یہ بات کہنی ہی کہ لوگ بیگناہ شراب خواروں کو ستاتے ہیں اس کو اس طرح ادا کرتے ہیں

بہر یک جرعہ کہ آزار کسش در پے نیست ۔۔۔ زحمتے میکشم از مردم ناداں کہ مپرس

ایک چلو کے پیچھے جس سے کسی کو تکلیف نہیں پہنچتی ہی بیوقوف آدمی (واعظ) سے ایسی زحمت اُٹھانی پڑتی ہی کہ نہ پوچھیے

ایک اُردو شاعر نے بھی خوب کہا ہے ؎

واعظ شراب پینے سے کافر ہوا میں کیوں   کیا ڈیڑھ چلو پانی میں ایمان بہ گیا

یہ بات کہ میں ہی تیرا عاشق نہیں ہوں بلکہ سینکڑوں تجھ پر فریفتہ ہیں اس انداز سے کہتے ہیں ؎

نہ من برآں گل عارض غزل سرایم و بس   کہ عندلیب تو از ہر طرف ہزار انند

صرف میں ہی اس پھول سے رخسار پر غزل سرائی نہیں کرتا ہوں بلکہ چاروں طرف سے ہزاروں بلبلیں اسیر چہک رہی ہیں

ان کے تمام شعروں میں جدت ہے۔ معمولی سی بات کو بھی وہ اس انداز سے کہتے ہیں کہ بیساختہ وجد کرنے کو جی چاہتا ہے۔

یہ خیال کہ واعظ دوسروں کو جس بات سے منع کرتا ہے خود اُس کو کیوں کرتا ہے ایک معمولی خیال ہے وہ اس کو کس لطیف پیرائے میں کہتے ہیں ؎

مشکلے دارم ز دانشمند مجلس باز پرس   توبہ فرمایاں چرا خود توبہ کمتر مے کنند

مجھے ایک مشکل آن پڑی ہے ذرا محفل کے عالم سے پوچھو کہ جو لوگ توبہ کا حکم دیتے ہیں وہ خود توبہ کیوں نہیں کرتے

اس میں جدت کے ساتھ بے انتہا شوخی اور ظرافت بھی ہے "مشکلے دارم" سے اس بات کا اظہار ہے کہ ہم نہایت نیک اور سادہ دل ہیں کہ اس قسم کی فریب کی باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں اس لیے مشکل میں پڑے ہوئے ہیں اور پھر خود نہیں پوچھتے بلکہ دوسرے سے کہتے ہیں کہ پوچھ دے تاکہ خود تماشہ دیکھیں اور اس پر طرہ یہ کہ اسی شخص سے یہ مشکل حل کراتے ہیں جس کے اندر یہ عیب ہے یعنی واعظ سے۔

بلندی | خواجہ کے اشعار موزر بندوق سے مشابہ ہیں جو دیکھنے میں خوبصورت نظر آتی ہے اور انسان کو وہم بھی نہیں گزرتا کہ یہ خوشنما زیور بڑے بڑے شہروں کو ہزار گز

دور ہی سے ٹھنڈا کر سکتا ہے ان کے اشعار کی لطافت اور نزاکت کو دیکھکر یہ خیال ہوتا ہے کہ ان میں زبان ہی کا ذائقہ اور شیرینی ہے لیکن جب معانی کی طرف خیال کیجئے تو بے انتہا بلند ہوتے ہیں۔ مثلاً ؎

شکر ایزد کہ میان من و اوصلح افتاد حوریان رقص کناں ساغر شکرانہ زدند

خدا کا شکر ہے کہ میرے اور اس کے درمیان میں صلح ہو گئی حوروں نے ناچتے ہوئے شکرانہ کے پیالے پیئے

اپنی اور معشوق کی صلح کو کس قدر اہم کر دیا یعنی گویا اس صلح کا زمین کو۔ آسمان کو یہانتک کہ حوروں کو بھی انتظار تھا اگر نہوتی تو خدا جانے کیا انقلاب عظیم ہو جاتا حوریں ہمہ تن منتظر کھڑی دیکھ رہی تھیں اور جب اُنھوں نے دیکھا کہ ہمارے درمیان میں صلح ہو گئی تو گائیں اور ناچیں اور شکرانے کے ساغر پیئے۔

سلاست کلام کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ سلیس اور آسان ہو مشکل سے مشکل اور باریک سے باریک مضامین مختصر اور عام فہم عبارت میں ادا کر دیئے جائیں۔ کلام میں اشکال۔ گنجلک یا تعقید کا واقع ہونا در اصل اس کے متکلم کی ناقابلیت کی دلیل ہے جو لوگ مشکل الفاظ اور استعارے استعمال کر کے اپنے کلام کو مغلق بنانے کی کوشش کرتے ہیں وہ بلغار اور فصحا کے نزدیک گونگے ہیں کہ اس پردہ میں اپنے عیب کو چھپاتے ہیں۔

ہندوستان میں ایک عام غلط فہمی یہ ہے کہ اس قسم کے مغلق کلام کو لوگ کہتے ہیں کہ بلیغ ہے۔ حالانکہ بلاغت سے وہ کوسوں دور ہے۔ کسی کلام کے بلیغ ہونے کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ وہ سلیس اور عام فہم ہو کیونکہ بلیغ کلام کی تعریف یہ ہے کہ "وہ فصیح کلام جو مقتضائے حال کے مطابق ہو" یعنی اس میں کوئی لفظ نامانوس نہو۔ اس کی ترکیب میں گنجلک اور تعقید نہ واقع ہو اور جس قسم کا موقع ہو اُسی قسم کے

الفاظ استعمال کیئے جائیں تاکہ جذبہ یا مافی الضمیر کا صحیح صحیح اظہار ہو نہ کہ کلام چیستان بنایا جائے۔

قدما کے کلام میں بالعموم سلاست پائی جاتی ہے۔ سعدی اور حافظ نے تو اپنے کلام کو پانی کر کے رکھدیا ہے۔ حافظ نے اعلیٰ سے اعلیٰ خیالات کو اپنے اشعار میں ادا کیا ہے۔ لیکن کہیں اشکال یا اغلاق ان کے کلام میں نہیں ہے یہ ممکن ہے کہ ان کے اشعار کے مضامین کی بلندی تک آدمی اپنی قابلیت سے نہ پہنچ سکے لیکن انکے الفاظ وہاں تک پہونچانے میں مساعدت کرنے سے کوتاہی نہیں کرتے۔

حافظ کے کلام کی یہ عجیب خوبی ہے کہ وہ اس قدر لطیف اور سلیس ہوتا ہے کہ چھوٹے چھوٹے بچے بھی آسانی سے سمجھ لیتے ہیں لیکن اس کے معانی کے تہ تک بڑے بڑے اہل کمال بھی مشکل سے پہنچتے ہیں۔

ان کی صوفیانہ غزلیں مثلاً۔

دوش وقت سحر از غصہ نجاتم دادند ۔۔۔ وندراں ظلمت شب آب حیاتم دادند

یا یہ غزل

زاہد خلوت نشین دوش بمیخانہ شد ۔۔۔ از سر پیماں گذشت بر سر پیمانہ شد

ہر کس و ناکس کے لیے دلکش ہیں۔ حالانکہ اس کے حقیقی مفہوم کے چہرہ سے پردہ اُٹھانے والے بہت کم لوگ ہیں۔

شوخی و ظرافت شاعری اور خاصکر غزل گوئی کا بڑا عنصر رندی ہے شاعر آزادی پسند ہوتا ہے اس لیے وہ ان لوگوں سے جو اسکی آزادی اور رندی میں مخل ہوں جلتا ہے۔ ان کو اپنا مخالف اور اپنے مقاصد میں سدّراہ سمجھتا ہے۔ اور اُن کی برائیاں

کرتا ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ شاعر واعظ محتسب ناصح۔ زاہد وغیرہ کا جو اس کو روکتے ہیں اور منع کرتے ہیں دشمن ہو اور ان کے مخفی عیوب کو فاش کرے۔ ان لوگوں کے مخفی عیوب مکاری اور ریاکاری وغیرہ ہیں۔ ظاہری تقوے کے آڑ میں اپنی نفسانی خواہشوں کو پورا کرتے ہیں۔ اور زہد کے لباس میں فریب دیکر عوام کو لوٹتے ہیں۔

ریاکار۔ مکار ہر زمانہ اور ہر قوم میں ہوتے ہیں لیکن مسلمانوں میں ایسے لوگ بیشتر بہت کم تھے چھٹی صدی سے یہاں بھی یہ جماعت بڑھنے لگی مولانا روم نے ان سے لوگوں کو خبردار کیا ؎

اے بسا ابلیس آدم روئے ہست　　　پس بہر دستے نباید داد دست

سعدی نے اپنی تصنیفات میں کئی ایسے ریاکار زاہدوں کے قصے بیان کیے ہیں اور غزلوں میں بھی ریاکاری وغیرہ کی قلعی کھولی ہے۔ مگر حافظ نے اس کو انتہا پر پہنچا دیا۔ کہتے ہیں ؎

واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبر می کنند　　　چوں بخلوت میروند آں کار دیگر می کنند

آں کے اشارہ میں کتنی شوخی ہے یہ نہیں کہتے کہ کونسا کام بلکہ اشارہ کرتے ہیں کہ "وہ کام"، گویا متکلم اور مخاطب اس کام کو پہلے ہی سے جانتے ہیں اور وہ ایسا کام ہے کہ لوگوں کے سامنے اس کا نام بھی نہیں لیا جا سکتا ایک جگہ کہتے ہیں ؎

من ایں مرقع پشمینہ بہر آں دارم　　　کہ زیر خرقہ کشم مے کس ایں گماں نبرد

میں یہ پیوند لگا ہوا ادنیٰ خرقہ اسلیے پہنتا ہوں کہ اسکے نیچے شراب چھپا کر پیوں اور کسی کو گمان بھی نہ ہو

ریاکار صوفی صوف کا جبہ پہنکر عوام میں اپنا تقدس ظاہر کرتا ہے اور در پردہ ایسے ایسے گناہ کرتا ہے کہ جن کا لوگ اس پر گمان بھی نہیں کر سکتے اس کی حالت کو خود اپنی حالت قرار دیکر بیان کرنا نہایت درجہ کی ظرافت ہے۔

حافظ نے جہاں بھی ان پر چوٹ کی ہے ایسی ظرافت اور شوخی کے ساتھ کی ہے کہ ان شعروں کے حسب حال جو واعظ یا صوفی ہوں وہ بھی اگر سنیں تو ایک دفعہ ان کو مزا آجائے بخلاف اس کے اردو کا شعر ملاحظہ ہو جو ایک نہایت مشہور شاعر کا ہے ؎

اک بزرگ آتے ہیں مسجد میں خضر کی صورت ۔۔۔ اپنے جوتوں سے رہیں سارے نمازی ہشیار

بزرگ اور وہ بھی خضر صورت بزرگ جوتے نہیں چرایا کرتے۔ اُردو شاعر کے نزدیک گویا ہر قسم کے عیوب واعظوں بزرگوں اور صوفیوں میں ہوتے ہیں یہانتک کہ اس نے جوتے چرانے تک کا الزام بھی ان پر لگا دیا۔

عشق و مستی | خواجہ کی اصلی شاعری کا خمیر عشق اور سرمستی ہے ان کے اوپر یہ جذبہ اسقدر غالب ہے کہ جھومنے لگتے ہیں۔ وجد میں آکر ناچتے ہیں۔ ہاتھ جھٹکتے ہیں۔ پاؤں پٹکتے ہیں۔ ان کے مستانہ اشعار سنیئے۔

بیا تا گل برافشانیم و مے در ساغر اندازیم ۔۔۔ فلک را سقف بشگافیم و طرح نو در اندازیم

اگر غم لشکر انگیزد کہ خون عاشقاں ریزد ۔۔۔ من و ساقی بہم سازیم و بنیادش براندازیم

چو در دست است رودے خوش بزن مطرب سرودے خوش ۔۔۔ کہ دست افشاں غزل خوانیم و پاکوباں سر اندازیم

یکے از عقل مے لافد یکے طامات مے بافد ۔۔۔ بیا کیں داوریہا را بہ پیش داور اندازیم

بیا جاناں منور کن ز رویت مجلس ما را ۔۔۔ کہ در بہشت غزل خوانیم و در پایت سر اندازیم

ایک دوسری غزل میں کہتے ہیں ؎

رقص بر شعرِ تر و نالۂ نے خوش باشد — خاصہ رقصے کہ در و دست نگارے گیرند

جوش | خواجہ نے رندی اور میخواری کے متعلق اس قدر پرجوش اشعار لکھے ہیں کہ تمام فارسی شاعری میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی مثلاً ؎

تا ز میخانہ و مے نام و نشاں خواہد بود — سرِ ما خاکِ رہِ پیرِ مغاں خواہد بود

جب تک شراب خانہ اور شراب کا نام باقی رہیگا اس وقت تک ہمارا سر پیرِ مغاں کی خاکِ راہ بنا رہیگا

ایک دوسری غزل میں کہتے ہیں ؎

ساقیا برخیز و در دہ جام را — خاک بر سر کن غمِ ایام را
گرچہ بدنامیست نزدِ عاقلاں — ما نمے خواہیم ننگ و نام را

ایک جگہ کس جوش کے ساتھ کہا ہے ؎

من ترکِ عشق بازی و ساغر نمے کنم — صد بار توبہ کردم و دیگر نمے کنم

میں عشق بازی اور شراب خواری کو نہ چھوڑوں گا۔ سو بار توبہ کر چکا اب نہ کروں گا۔

دنیا کی بے ثباتی کی حقیقت ان پر ایسی کھل گئی تھی کہ وہ اس کے جاہ و جلال کو ہیچ سمجھتے تھے اور بادشاہوں کی شوکت و حشمت ان کی نگاہ میں بچوں کا کھیل تھی اس مضمون کو بھی بڑے جوش کے ساتھ بیان کرتے ہیں ؎

کہ برد بہ نزدِ شاہاں زمنِ گدا پیامے — کہ بکوئے مے فروشاں دو ہزار جم بجامے

بادشاہوں کے پاس یہ میرا پیام کون پہنچاتا ہے کہ میفروشوں کی گلی میں دو ہزار جمشید ایک پیالے پر بکتے ہیں

بفشاں جرعۂ بر خاک و حالِ اہلِ دولت بیں — کہ از جمشید و کیخسرو ہزاراں داستاں دارد

ایک چلو خاک پر چھڑک دو اور بادشاہوں کا حال دیکھو کہ جمشید اور کیخسرو کے ہزاروں قصے بیان کرتی ہے

نقشہ کھینچنا | خواجہ کیفیات اور جذبات کا نقشہ خوب کھینچتے ہیں۔ اس موقع پر مجھے

ایک واقعہ یاد آیا کہ طالب علمی کے زمانہ میں عبد الغفور نامی ایک کشمیری نوجوان نہایت خوبصورت اور حسین ہمارے ساتھ پڑھتے تھے سخن فہمی کا صحیح مذاق رکھتے تھے اور ذہین اور طباع آدمی تھے عربی شعرا میں سے ابو نواس کی جدت طرازیاں انکو بہت پسند تھیں اور حافظ کو تو تمام دنیا کے شاعروں سے بہتر خیال کرتے تھے ایک دن کچھ شعر و شاعری کا تذکرہ تھا کہنے لگے کہ حافظ اپنے جذبات کی جیسی تصویر کھینچتا ہے ایسی کوئی کیا کھینچے گا دیکھئے کیا خوب کہتا ہے ؎

سیر درسِ عشق دارد دل دردمند حافظ — کہ نہ خاطرِ تماشا نہ ہوائے باغ دارد

حافظ کا دردمند دل عشق ہی کا سبق رٹنا چاہتا ہے اس کو نہ سیر کا خیال ہے نہ باغ کی خواہش ہے

بیدلی کی حالت میں تماشہ اور سیر باغ کی خواہش کا نہ ہونا اور عشق میں محو پڑے رہنا کسقدر فطرتی امر ہے اور عاشق کے استغراق کی کیسی سچی تصویر ہے۔

معشوق کی شوخی اور خرام ناز کی کیا عمدہ تصویر کھینچی ہے ؎

آن لعل دلکش بین و آن خندۂ پرآشوب — آن رفتن خوشش بین و آن گام آرمیدہ

اسکے دلکش سرخ لب اور اسکی شور انگیز ہنسی دیکھو — خرام ناز اور اس کا آہستہ آہستہ قدم اُٹھانا دیکھو

اس شعر میں معشوقانہ تمکنت کا کس خوبصورتی کے ساتھ نقشہ کھینچا ہے ؎

ہزار دیدہ بروئے تو ناظر اند و تو خود — نظر بروئے کسے برنمی کنی از ناز

ہزار آنکھیں تیرے چہرے کو دیکھ رہی ہیں اور تو خود ناز سے کسی کی طرف نگاہ نہیں اُٹھاتا

میں نے کہا کہ فرزدق نے بھی اسی مضمون کا خوب شعر کہا ہے۔

یغضی حیاءً ویغضٰی من مہابتہ — فما یکلم الا حین یبتسم

وہ حیا سے آنکھیں نیچی رکھتے ہیں اور لوگ اُن کے رعب سے اور جب وہ باتیں کرتے ہیں تو مسکراتے ہوئے

کہنے لگے رعب اور چیز ہو اور معشوقانہ ناز اور شی ہو۔ حقیقت یہ ہو کہ حافظ کا شعر بہت بلند ہو فرزدق کے شعر سے یہ معلوم ہوتا ہو کہ ممدوح کے رعب سے لوگ نگاہیں نیچی کئے ہوئے ہیں اور حافظ کا معشوق اس قدر دلکش ہو کہ نگاہ اس سے ہٹ ہی نہیں سکتی۔ پھر اسی شعر کو پڑھکر جھومنے لگے میں نے کہا کہ حافظ نے بہت سچ کہا ہو ؎

بشعر حافظ شیراز میرقصند و مے نازند ۔۔۔ سیہ چشمان کشمیری و ترکان سمرقندی

حافظ شیراز کے شعروں پر ناچتے ہیں اور ناز کرتے ہیں کشمیر کے کالی آنکھوں والے اور سمرقند کے ترک

چونکہ وہ بھی "سیہ چشمان کشمیری" میں داخل تھے اس لیے جھیپے۔ اس وقت تو یوں ہی بات کو ٹالدیا مگر دوسرے دن اس کا بدلہ لیا۔ بات یہ ہوئی کہ میرے یہاں کوئی تقریب تھی اور میرے دوست کو مٹھائی بہت پسند تھی میں نے انکو مٹھائی بھیجی آپ نے رسید میں یہ شعر لکھ بھیجا ؎

شکر فروش کہ عمرش دراز باد چرا ۔۔۔ تفقدے نکند طوطی شکر خارا

صنائع بدائع ۔ یہ ایک مرض ہو جو شعراء کو اکثر لاحق ہوجاتا ہو اور اس سے ان کی نفس شاعری بہت کمزور ہوجاتی ہو۔ بڑے بڑے شعراء مثلاً خسرو اور سلمان ساوجی بھی اس کو نہیں نباہ سکے ہیں اور اس کی بدولت ان کی شاعری میں نقائص پیدا ہوگئے ہیں۔ خواجہ کے یہاں بھی صنائع بدائع بہت کثرت سے ہیں۔ لیکن ان کی شاعری کا زیور بن گئے ہیں۔ مثلاً ؎

گدائے کوئی تو از ہشت خلد مستغنی است ۔۔۔ اسیر بند تو از ہر دو عالم آزاد ست

اس میں صنعت تضاد ہو۔ گدا و مستغنی۔ اسیر و آزاد متضاد الفاظ ہیں۔

احرام چہ بندیم کہ آں قبلہ نہ اینجاست ۔۔۔ درسعے چہ کوشیم کہ از مروہ صفا رفت

اس میں صنعت مراعات النظیر ہی۔ احرام۔ قبلہ۔ سعی۔ صفا و مروہ سب الفاظ ایک ہی چیز یعنی حج کے متعلق ہیں اور سعی جو ایک رکن کا نام ہی۔ اس کے لفظی معنی بھی کوشش کے ہیں۔ صفا و مروہ ان دو پہاڑوں کا نام ہی۔ جن پر سعی ہوتی ہی اور صفا کے معنی پاکیزگی کے بھی ہیں جو یہاں پر مراد لیے گئے ہیں غور سے دیکھئے تو اس شعر میں کئی صنعتیں ہیں۔

علاوہ بریں لفظی صنائع تجنیس وغیرہ بھی ان کے کلام میں بہت ہیں۔

عربیت حافظ کے دیوان میں کئی سو اشعار خالص عربی کے ہیں جو انہیں کے کہے ہوئے ہیں اور جن سے ان کی کمال عربی دانی کا ثبوت ملتا ہی۔ قران کی آیتوں کو اس خوبصورتی سے شعر میں داخل کر دیتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہی کہ کسی زیور پر ہیرا جڑ دیا گیا مثلاً ؎

بہ حسن عارض و قد تو بردہ اند پناہ　　بہشت و طوبے۔ طوبےٰ لہم وحسن مآب

تیرے رخسار اور قد کے حسن میں بہشت و طوبی نے پناہ لی خوشخبری ہو ان کو ان کا ٹھکانا بہت اچھا ہی

طوبیٰ لہم وحسن مآب آیت ہی اور کس موقع سے اس کو لائے ہیں!!۔

اس شعر میں دوسرا مصرعہ قران کی آیت ہی۔

شب وصل است و طے شد نامہ ہجر　　سلٰمٌ ھی حتّٰی مطلع الفجر

وصل کی رات ہی اور ہجر کا زمانہ گزر گیا صبح کے نکلنے تک امن ہے

کہیں حدیث اور ضرب المثل لاتے ہیں مثلاً ؎

بصوت بلبل و قمری اگر نوشی مے　　علاج کے کنمت آخر الدّواء الکے

بلبل اور قمری کی آواز پر اگر تم شراب نہ پیوگے تو میں داغ کر تمہارا علاج کرونگا آخری علاج داغنا ہی ہو

آخر الدواء الکے" صحیح حدیث ہی ؎

ہر چند آزمودم ازوے نبود سودم ۔۔۔۔ مَن جَرَّبَ المُجَرَّب حلت بِہ النَّدامة

جس قدر بھی میں نے آزمایا مجھے اس سے نفع نہیں ہوا جو شخص آزمائی ہوئی چیز کو آزماتا ہی پشیمان ہوتا ہی

دوسرا پورا مصرعہ ضرب المثل ہی۔

خواجہ کی پہلی غزل کے اس مصرعہ پر

متی ما تلق من تھوی دع الدنیا و اھملھا

مولانا آزاد بلگرامی اعتراض کرتے ہیں کہ جب شرط کی جزا۔ امر۔ نہی یا جملہ اسمیہ ہو تو عربی قاعدہ کے مطابق اس پر ف کا لانا ضروری ہی یعنی "فدع" ہونا چاہیے تھا۔ چنانچہ اُنھوں نے اس پر دست اصلاح بھی صاف کیا ہی اور اس طرح بنایا ہی۔

دع الدنیا متی ما تلق من تھوی و اھملھا

کیونکہ جزا کے مقدم کرنے سے ف کا لانا ضروری نہیں رہتا۔

ہم اس پر اچھی طرح بحث کرتے مگر حافظ کی روح کہیگی کہ "شعر مرا بمدرسہ کہ برد" اصلیت یہ ہی کہ بہت سی ایسی باتیں جو دوسروں کے لیے جائز نہیں ہوتی ہیں شعرا کے لیے جائز ہوتی ہیں رضی وغیرہ نے مذکور بالا قاعدہ کے ذیل میں شعرا کے لیے اس کو مباح کیا ہی اور ایسی مثالیں خود عربی شعرا کے اشعار سے پیش کی ہیں۔

پاکیزگی۔ خواجہ کے دو صدی پیشتر سے فارسی شعرا کو ہزلیات اور فحش ہجویات کہنے کی عادت پڑگئی تھی اور یہانتک یہ بات عام ہوگئی تھی کہ بڑے بڑے اہل کمال اس کے مرتکب ہوتے تھے اور ان کے دامن کمال پر اس سے کوئی دھبہ نہیں آتا تھا ابو العلائی گنجوی۔ حکیم انوری۔ حکیم سوزنی۔ یہانتک کہ حکیم سنائی بھی اس سے نہیں بچ سکے۔

سب تو سب شیخ سعدی جیسا اخلاق کا معلم اور دنیا کا ناصح بھی اپنا جبہ و دستار پھینک کر اس دریا میں بے خوف کود پڑا اور وہ کرشمے دکھائے کہ اللہ کی پناہ مگر ایک خواجہ ہیں جن کا کلام ان لغویات سے بالکل پاک ہے جو ان کے کمال متانت اور سنجیدگی کی دلیل ہے۔ یہانتک کہ ان کے کلام میں کوئی مکروہ اور کثیف لفظ تک نہیں آیا فیضی اپنے کلام کی پاکیزگی کا دعویٰ کرتے ہوئے کہتا ہے ؎

بداں مے ماند ایں پاکیزہ گفتم   کہ در دیوان حافظ نام سگ نیست

شیخ محمد یحییٰ لکھتے ہیں کہ غالباً فیضی کی نظر سے خواجہ کا یہ شعر نہیں گذرا۔

شنیدہ ام کہ سگاں را قلادہ می بندی   چرا بگردن حافظ نمی نہی رسنے

مگر ہمارے پاس دیوان کے جسقدر نسخے ہیں ان میں سے صرف ایک نسخہ میں یہ شعر ہم کو ملا ورنہ ہر ایک میں مقطع اس طرح پر ہے ؎

مزاج دہر تبہ شد دریں بلا حافظ   کجاست فکر حکیمے و رائے برہمنے

وہ مقطع دراصل امیر خسرو کا ہے۔

تصوّف

انسان اپنی انتہائی علمی کوشش سے اس نتیجہ پر پہونچا ہے کہ اس کو عالم موجودات کی حقیقت نہیں معلوم ہو سکتی۔ بڑے بڑے فلسفیوں نے آخر میں مجبور ہو کر یہی کہا کہ۔ع

معلومم شد کہ ہیچ معلوم نہ شد

خواجہ نے بھی اسی مضمون کو جابجا بیان فرمایا ہے۔ ؎

برو اے زاہد خود بیں کہ ز چشم من و تو　　راز ایں پردہ نہان است نہاں خواہد بود

چل اے زاہد خود بین کہ میری اور تیری دونوں کی نگاہوں سے اس پردہ کا راز پوشیدہ ہے اور پوشیدہ رہیگا

دوسرا شعر ہے ؎

نشوی واقف یک نکتہ ز اسرار وجود　　گر تو سرگشتہ شوی دائرۂ امکاں را

وجود کے اسرار کی ایک رمز سے بھی تو واقف نہیں ہو سکتا۔ چاہے تمام عالم کا چکر لگا آئے

خود اپنی ہی خبر نہیں کہ ہم کون ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں؟ کہاں جائیں گے؟ خواجہ کہتے ہیں ؎

عیاں نہ شد کہ چرا آمدم؟ کجا بودم　　دریغ و درد کہ غافل ز کار خویشتنم

معلوم نہ ہوا کہ میں کیوں آیا؟ اور کہاں تھا؟ افسوس ہے کہ اپنے ہی معاملہ سے بے خبر ہوں

دوسری جگہ کہا ہے ؎

وجود ما معمائیست حافظ　　کہ تحقیقش فسونست و فسانہ

اے حافظ ہمارا وجود بھی ایک معما ہے جس کی حقیقت کا دریافت کرنا کوشش بے سود ہے

ایک غزل میں فرماتے ہیں ؎

در اندرون من خستہ دل ندانم کیست　　کہ من خموشم و او در فغان و در غوغاست

مجھے معلوم نہیں کہ مجھ خستہ دل کے اندر کون ہے کہ میں تو خاموش ہوں لیکن وہ شور و فریاد مچا رہا ہے

اصلیت یہ ہے کہ عالم موجودات کی حقیقت اور اس کے اسرار کا علم انسان کی عقل کی دسترس سے بالاتر ہے۔ لیکن اگر کچھ اس کا پتہ چل سکتا ہے تو صرف تصوف سے۔ اس لیے کہ ریاضت روحانی اور مجاہدہ باطنی سے دل کا آئینہ صاف ہو جاتا ہے اور اس میں اسرار کائنات کا عکس خود بخود جلوہ نما ہونے لگتا ہے۔ فلسفہ یا اور کسی

کتابی علم سے اس کی تحصیل ممکن نہیں ہے۔ خواجہ فرماتے ہیں ؎

بشو اوراق اگر ہم درس مائی — کہ علم عشق در دفتر نباشد

اگر تم ہمارے ہم سبق ہونا چاہتے ہو تو کتابوں کو دھو ڈالو۔ کیونکہ تصوف کا علم کتابوں میں نہیں ہوتا

گو ذوقی اور وجدانی سہی۔ لیکن علم و معرفت کا یہی ایک ذریعہ ہے۔ دنیا کے اکثر بڑے بڑے لوگ اسی شاہراہ پر چلے ہیں۔ اور اُنھوں نے یقین کیا ہے کہ انسان کے اندر ایک باطنی شعبہ ایسا موجود ہے کہ اس کو ریاضت روحانی سے ترقی دیکر وہ معرفت کے اسرار تک پہنچ سکتا ہے خواجہ کہتے ہیں ؎

ہر کہ شد محرم دل در حرم یار بماند — وآنکہ ایں کار ندانست در انکار بماند

جو شخص اپنے دل کا رازداں ہو گیا وہ یار کے کوچہ میں پہنچ گیا۔ اور جو اس سے واقف نہ ہوا انکار ہی کرتا رہا

اگر ایک شخص ماونٹ ایورسٹ پر کھڑا ہو کر عالم کو مخاطب کرے۔ بلند آسمانوں سے چمکتے ہوئے ستاروں سے۔ اونچے ہمالہ سے۔ لمبی چوڑی زمین سے۔ گہرے اور وسیع سمندر سے دریافت کرے کہ تم کیا ہو؟ تمھاری ہستی اور حقیقت کیا ہے؟ تو اسے کوئی جواب نہیں ملے گا۔ لیکن اگر وہ آنکھیں بند کر کے خود اپنے دل میں غور کرے تو اسی میں کچھ بند سوتے ایسے ملیں گے جن سے علم حقیقی کا آب حیات حاصل ہو سکتا ہے۔ اور کچھ گرہیں ایسی پائیگا جن کے کھولنے سے اصلیت کا سراغ لگ سکتا ہے بس صوفی کا یہ کام ہے کہ ان سوتوں کو نکالے اور ان دل کی بندھی ہوئی گرہوں کو کھولے خواجہ فرماتے ہیں ؎

گرہ ز دل بکشا و ز سپہر یاد مکن — کہ فکر ہیچ مہندس چنیں گرہ نکشاد

اپنے دل کی گرہ کھولو اور آسمان کا ذکر نہ چھیڑو کیونکہ کسی مہندس کی فکر اس گرہ کو نہیں کھول سکی ہے

اور یہ دل کی گرہیں کس طرح پر کھل سکتی ہیں؟ صرف عشق کے ناخن سے خواجہ فرماتے ہیں ؎

دلم خزانۂ اسرار بود و دست قضا　　　درش ببست و کلیدش بدلستانے داد

میرا دل اسرار کا خزانہ ہی لیکن خدا نے اس پر قفل لگا کر اس کی کنجی ایک معشوق کے حوالہ کر دی ہے
اس معشوق کا ملنا کچھ ناممکن نہیں ہی۔ اگر انسان ہمت کرے اور توفیق اسکی رہبر ہو تو اسکا جلوہ نظر آجاتا ہی خواجہ نے کہا ہی ؎

جمال یار ندارد نقاب و پردہ ولے　　　غبار رہ بنشاں تا نظر توانی کرد

حسن یار بالکل بے نقاب اور بے پردہ ہی راستہ سے غبار صاف کر دو نظر آنے لگے گا

ایک دوسری غزل میں کہا ہی ؎

میان عاشق و معشوق ہیچ حائل نیست　　　تو خود حجاب خودی حافظ از میان برخیز

عاشق اور معشوق میں کوئی شئ حائل نہیں ہی۔ حافظ تو اپنا پردہ آپ بنا ہوا ہی درمیان سے اُٹھ جا

یہاں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ غبار راہ سے کیا مراد ہی۔ یعنی "خودی" اگر انسان خودی کو ترک کر دے تو جمال یار بے حجاب اُس کو نظر آنے لگے۔

خودی کیا ہی؟ اس کے سمجھنے کے لیے کسی قدر تفصیل کی ضرورت ہی۔

موجودات عالم میں انسان اپنے آپ کو سب سے اشرف سمجھتا ہی اور ہی بھی درحقیقت۔

مگر اس کے اشرف ہونے کی عام طور پر یہ وجہ خیال کی جاتی ہی کہ جمادات نباتات اور حیوانات میں انسان کی طرح نہ عقل ایجاد ہی۔ نہ تمدن ہی۔ اس لیے انسان سب سے برتر ہی اور تمام عالم کا بادشاہ ہی۔

لیکن اہل دل کے نزدیک انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کے وجوہ یہ نہیں ہیں۔ کیونکہ یہ سب چیزیں یعنی عقل ایجاد اور تمدن انسان کے انہیں جذبات کے خدمتگزار ہیں جو جماداتی یا نباتاتی یا حیوانی ہیں۔ فرض کرو کہ بادشاہ نے ایک عالی شان محل بنایا ہر قسم کے آرائشی سازوسامان اور زریں آلات و فروش سے آراستہ کیا۔ طرح طرح کے

نقش و نگار اور بیل بوٹے بنائے۔ قسم قسم کے پھول لگائے۔ بجلی کے چراغ روشن کیئے اور شان و شوکت کے ساتھ اس میں جلوس فرمایا۔ اور فقیر آسمان کی چھت کے نیچے ویران بیابان میں فرش خاک پر بیٹھا۔ تو اس سے بادشاہ کی انسانیت میں کیا اضافہ ہوا۔ اور فقیر کی انسانیت میں کیا کمی آئی؟ کچھ بھی نہیں۔ بلکہ بادشاہ کے حیوانی جذبات عیش پسندی۔ خود بینی اور غرور و ناز میں اور زیادتی ہو گئی۔ اب اگر اس سے یہ اضافی کرو فر اور ساز و سامان چھین لیا جائے تو اسکی روح کو قلق ہو گا۔ وہ غریب تو اور کانٹوں میں اُلجھ گیا۔ اور فقیر پھر بھی آزاد رہا۔

اس سے معلوم ہوا کہ انسانیت کا درجہ ان چیزوں سے بلند ہے۔ اسکی ابتدا در اصل عشق حقیقی سے شروع ہوتی ہے۔ خواجہ کہتے ہیں ؎

بر در میخانۂ عشق اے ملک تسبیح گوئے کاندر آنجا طینت آدم مخمر می کنند

اے فرشتہ عشق کے میخانہ کے دروازہ پر بیٹھکر تسبیح پڑھ۔ کیونکہ یہی وہ جگہ ہے جہاں آدم کا خمیر تیار کیا جاتا ہے

ہر قسم کے طبعی جذبات۔ اور تمام مادی کثافتیں جو دنیا کی کسی چیز میں ممکن ہیں سب انسان کے اندر موجود ہیں۔ اور عقل۔ علم۔ جماعت کا اثر۔ سلطنت کا قانون کوئی چیز بھی ان کثافتوں سے اسکو پاک نہیں کر سکتی۔ ہاں اگر کوئی شے اُسے پاک کرنے کے لیے ہے تو صرف عشق ہے۔ یہی وہ بھٹی ہے جس میں جلکر انسان خالص کندن ہو جاتا ہے اور یہ وہ خصوصیت ہے کہ جمادات۔ نباتات اور حیوانات کو تو کیا فرشتوں کو بھی حاصل نہیں ہے۔ خواجہ فرماتے ہیں ؎

جلوۂ کرد رخش دید ملک عشق نداشت عین آتش شد ازیں غیرت و بر آدم زد

اسکے چہرہ نے جلوہ دکھلایا۔ دیکھا کہ فرشتہ میں عشق نہیں ہے اس غیرت سے آگ کا شعلہ بنکر آدم پر لپک گیا

لیکن عشق کی منزل سخت کڑی منزل ہے۔ اس میں وہ تمام جذبات اور خواہشیں جو انسان کے اندر موجود ہیں قربان کردینی پڑتی ہیں اور مادی ہستی کے چمن کو آگ لگا دینا پڑتا ہے۔ تب انسان انسان ہوتا ہے۔ خواجہ فرماتے ہیں ؎

جناب عشق را در گہ بسے بالاتر از عقل است   کسے آں آستاں بوسد کہ جاں در آستیں دارد

عشق کے سرکار کی درگاہ عقل سے بہت زیادہ بلندی پر ہے۔ وہی شخص اسکی آستان بوسی کرسکتا ہے جو جان ہتھیلی پر رکھے

اسی مادی ہستی کا نام ہے "خودی"

جب تک انسان اس خودی سے قدم باہر نہ نکالیگا۔ اس وقت تک وہ معرفت سے بے بہرہ رہیگا۔ خواجہ کہتے ہیں ؎

تو کز سرائے طبیعت نمی روی بیروں   کجا بکوئے حقیقت گذر توانی کرد

تو اپنے طبعی جذبات کے دائرے سے تو باہر نکلتا ہی نہیں پھر بھلا حقیقت کے کوچہ میں تیرا گذر کیونکر ہو

خواجہ کے اشعار میں جابجا اس بات کی تحریک پائی جاتی ہے کہ لوگ کیوں مادی جذبات کی خدمت میں مصروف ہیں اور روحانی ترقی اور معرفت کی طرف کیوں توجہ نہیں کرتے فرماتے ہیں ؎

بال بکشا و صفیر از شجر طوبیٰ زن   حیف باشد چو تو مرغے کہ اسیر قفسی

پر کھول اور طوبے کے درخت پر جاکر چہچہا۔ افسوس ہے کہ تجھ جیسی چڑیا پنجرے میں قید رہے

خواجہ کا تمام دیوان شروع سے آخر تک اسی قسم کے روحانی لطائف اور حقیقی اسرار سے لبریز ہے۔ جو لوگ تصوف کے کوچے سے باخبر اور معرفت کے راز سے واقف ہیں وہی کچھ ان لطائف و اسرار کا حظ اُٹھا سکتے ہیں یہ وہ چیزیں نہیں ہیں جو الفاظ اور عبارت سے ذہن نشین کرائی جاسکیں ؎

شعر حافظ ہمہ بیت الغزل معرفت است　　آفریں بر نفس دلکش و لطف سخنش

اخلاق

دنیا میں اگر سب سے بہتر کوئی شئے ہے تو وہ محبت ہے۔ یہ ایک ایسی تلوار ہے جس سے ان تمام برائیوں کی جو انسان میں موجود ہیں گردن کاٹی جاسکتی ہے۔ اگر کسی شخص کے اندر فطرتاً محبت کا مادہ موجود ہے تو یقیناً اس کے تمام اخلاق پسندیدہ ہوں گے۔ بزرگوں کی اخلاقی خوبیوں کی جڑ یہی محبت ہے

خواجہ کے کلام سے بھی محبت کا شیرہ چھن چھن کے ٹپکتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ دنیا میں کسی سے رنجیدہ ہونا اسی کا نام کفر ہے؎

قفا خوریم و ملامت کشیم و خوش باشیم　　کہ در طریقت ما کافریست رنجیدن

ہم دھکے کھاتے ہیں۔ ملامت سنتے ہیں اور خوش رہتے ہیں۔ کیونکہ ہمارے مذہب میں کسی سے رنجیدہ ہونا کفر ہے

یہ وہی صوفیانہ اور مقدس تعلیم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ہے کہ اگر کوئی دائیں گال پر تمانچہ مارے تو بایاں بھی سامنے کردو۔ چادر چھینے تو کرتہ بھی اُتار کر دیدو۔ افسوس ہے کہ تمام دنیا صوفی اور فلسفی نہیں ورنہ یہ وہ تعلیم ہے کہ اس کی بدولت چمن دنیا سے باہمی عداوت کی بیخ و بن اُکھاڑ کے پھینکی جاسکتی ہے۔

کس جوش کے ساتھ فرماتے ہیں؎

چناں بزی کہ اگر خاک رہ شوی کس را　　غبار خاطرے از رہگذار ما نرسد

اس طرح زندگی بسر کرو کہ اگر تم کسی کے راستہ کی خاک بھی بنجاؤ تب بھی تمہارے غبار سے کسی کا دل مکدر نہونے پائے

ایک جگہ اور کہا ہے؎

مباش در پئے آزار و ہر چہ خواہی کن ۔ کہ در شریعت ما غیر ازیں گناہی نیست

کسی کو ستانے کے پیچھے مت پڑو اور جو کچھ چاہو کرو۔ کیونکہ ہمارے مذہب میں بجز اسکے اور کوئی گناہ نہیں ہے

دوستی کی ترغیب دلاتے ہیں ؎

درخت دوستی بنشاں کہ کام دل ببار آرد ۔ نہال دشمنی برکن کہ رنج بے شمار آرد

دوستی کا درخت لگاؤ کہ دل کی مراد کا پھل دے۔ اور دشمنی کا پودا اکھاڑ ڈالو کیونکہ اس سے بیشمار تکلیفیں پہنچتی ہیں

صلح اور نرمی سے دونوں جہاں کے مقصد حاصل ہوتے ہیں ؎

آسائش دو گیتی تفسیر این دو حرفست ۔ با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا

دنیا کی نعمت اور دولت سب فانی ہیں۔ یہ اس قابل نہیں کہ ان کے واسطے انسان لڑے جھگڑے۔ اور انسانی شرافت پر دھبہ لگائے ؎

نزاع بر سر دنیائے دوں بنا بد کرد ۔ بآشتی ببر اے نور دیدہ گوئے فلاح

ذلیل دنیا کے لیے جھگڑنا نہیں چاہیے۔ جان من! صلح رکھو۔ اسی سے کامیابی کی بازی جیت سکو گے

عیب گیری ایک ایسا عیب ہے کہ اس سے انسان کے صاف دل پر بہت جلد زنگ بیٹھ جاتا ہے اور یہ عیب خود بینی۔ خود رائی۔ تحقیر غرض بہت سے عیبوں کا تخم انسان کے اندر بو دیتا ہے۔ اور محبت کو کھو دیتا ہے۔ خواجہ کہتے ہیں ؎

عیب درویش و توانگر بہ کم و بیش بدست ۔ کار بد مصلحت آنست کہ مطلق نہ کنیم

امیر غریب کسی کی عیب گیری کم ہو یا زیادہ بری ہے۔ اور مصلحت یہ ہے کہ برا کام ہم مطلق نہ کریں

خواجہ دو رنگی سے بہت جلتے ہیں ؎

رنگ تزویر پیش ما نبود ۔ شیر سرخیم و افعی سیہیم

مکاری کا رنگ ہمارے پاس نہیں ہے۔ ہم جو شیر ہیں تو سرخ اور سانپ ہیں تو سیاہ

بھورا شیر اور مٹیالا سانپ ڈر سے نہیں پہچانا جاتا۔

اسی وجہ سے ریاکاروں سے ان کو سخت نفرت ہی اور نہایت زوردار الفاظ میں انکی جابجا مذمت کی ہی ؎

حافظا میخور و رندی کن و خوش باش ولے — دام تزویر مکن چون دگران قرآں را

ریا حلال شناسند و جام بادہ حرام — زہے شریعت و مذہب زہے طریقت و کیش

بادہ نوشی کہ درو ہیچ ریائے نہ بود — بہتر از زہد فروشی کہ درو روئے و ریا ست

بزیر دلق مرقع کمندہا دارند — دراز دستی این کوتہ آستیناں بیں

صوفی شہر بیں کہ چوں لقمۂ شبہ میخورد — پاردمش دراز باد۔ ایں حیوان خوش علف

اخلاقی معلموں کی دنیا میں کمی نہیں ہی۔ لیکن فرق جو ہوتا ہی وہ کیفیت ادا میں ہوتا ہی ایک شخص ایک بات بتاتا ہی کچھ اثر نہیں ہوتا۔ دوسرا اس انداز سے کہتا ہی کہ روح اس کو شہد کی طرح چاٹنے لگتی ہی۔ مثلاً نیکی اور احسان کو سب اچھا کہتے ہیں۔ خواجہ اسی عام مضمون کو اس طرح ادا کرتے ہیں ؎

بریں رواقِ زبرجد نوشتہ اند بزر — کہ جز نکوئی اہل کرم نخواہد ماند

آسمان کے اس سبز ایوان پر سنہری حرفوں میں لکھا ہوا ہی کہ بجز اہل کرم کی نیکی کے اور کوئی چیز باقی نہ رہیگی

اسی طرح کی بہت سی اخلاقی تعلیم اُنھوں نے نہایت دلپذیر طریقہ سے دی ہی۔ مثلاً

خودغرضی چھوڑ دینے سے آدمی کامیاب و مقبول ہوتا ہے

طریق کام جستن چیست ترک کام خود گفتن　　کلاہ سروری اینست اگر از ترک بردوزی

غرور سے انسان ناکام رہتا ہے اور خاکساری سے منزل مقصود تک پہنچ جاتا ہے۔

زاہد غرور داشت، سلامت نہ برد راہ　　رند از رہ نیاز بدار السلام رفت

فرض ادا کرتے رہو اور مذہبی بحث سے کنارہ کشی کرو

فرض ایزد بگذاریم و بکس بد نہ کنیم　　ور بگویند روا نیست نگوئیم روا ست

زندگی کو غنیمت سمجھو۔ اور جو سلوک ہو سکے کر ڈالو

چو بر روئے زمیں باشی توانائی غنیمت داں　　کہ دوران ناتوانیہا بسے زیر زمیں دارد

جب دل پاک ہو تو دیر و کعبہ برابر ہے

چوں طہارت نبود کعبہ و بت خانہ یکیست　　نبود خیر دراں خانہ کہ عصمت نبود

بے ادب بزرگوں کے فیض سے محروم رہتا ہے

حافظا علم و ادب ورز کہ در مجلس شاہ　　ہر کرا نیست ادب لایق صحبت نبود

بجز اللہ کے اور کسی کے آگے حاجت پیش کرنا ذلت ہے

حافظ آب رخ خود بر در ہر سفلہ مریز　　حاجت آں بہ کہ بر قاضی حاجات بریم

یورپ کے بعض ظاہر پرست مصنفوں نے جو روحانیت سے بالکل ذوق آشنا نہیں ہیں خواجہ کے رندانہ اور مستانہ اشعار کو دیکھکر یہ لکھا ہے کہ انکا فلسفہ اخلاق وہی ہے جو اپیکورس کا تھا لیکن یہ ان کی سخت نافہمی ہے۔ خواجہ معرفت کو شراب۔ ارباب ذوق کو ساقی۔ وجد کو مستی وغیرہ الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور اسی طرح کی بہت سی اصطلاحیں ان کے کلام میں آتی ہیں جن کو ایشیا کے

سخن فہم عام طور پر سمجھتے ہیں۔ ان کی رندی و سرمستی اس قسم کی نہیں ہے جیسی اپیکورس کی تھی اور جو سراسر ناعاقبت اندیشی پر مبنی تھی۔ ان کا جام شاعری مدرخمریہ کے زہر ہلاہل سے بالکل پاک ہے۔ ان کی خوشی حقیقی خوشی ہے۔ اب اس موقع پر صاف کہنا پڑا کہ دراصل اُن کے کلام کا زیادہ تر حصہ رسول پاک کی تعریف میں ہے۔ اُنھوں نے ہرچند اس کو کنایتاً بیان کرنے کی کوشش کی ہے لیکن بعض بعض جگہ صاف نمایاں ہوگئی ہے مثلاً

بدل ربائی اگر خود سرآمدی چہ عجب
کہ نورِ حسنِ تو بود از اساس آدم پیش

گرچہ شیرینِ دہناں پادشہانند ولے
آں سلیمانِ زمانست کہ خاتم با اوست

ملک در سجدۂ آدم زمیں بوس تو نیت کرد
کہ در حسنِ تو چیزے یافت بیش از نور انسانی

توئی آں گوہر یکدانہ کہ در عالم قدس
ذکرِ خیرِ تو بود حاصلِ تسبیحِ ملک

گشتیم جہاں را کہ بسی نیم و ندیدیم
مثلِ تو کسے را کہ بود میرِ قبائل

نگارِ ما کہ بہ مکتب نرفت و خط ننوشت
بغمزہ مسئلہ آموز صد مدرس شد

کہیں کہیں وہ پیک (پیغمبر) کے لفظ سے کنایہ کرتے ہیں مثلاً

آں پیکِ نامور کہ رسید از دیارِ دوست
آورد حرزِ جاں ز خطِ مشکبارِ دوست

خوش میدہد نشانِ جمال و جلالِ یار
خوش میکند حکایتِ عز و وقارِ دوست

الغرض خواجہ کا کلام روحانی وجد و ذوق اور حقیقی جذبات و لطائف کا مجموعہ ہے جس پر مجازی رندی اور عاشقی کا غلاف پڑا ہوا ہے۔ وہ خود فرماتے ہیں ؎

دوستاں در پردہ میگویم سخن گفتہ خواہد شد بدستاں نیز ہم

حافظ اور سعدی

یہ ٹھیک نہیں معلوم کہ فارسی شاعری کی ابتدا کب سے ہوئی لیکن یہ امر مسلم ہے کہ فارسی کا سب سے پہلا شاعر جس کا دیوان مل سکا ہے حافظ ابوالحسن رودکی ہے جو چوتھی صدی ہجری میں گزرا ہے۔

اگرچہ اس زمانہ میں شاعری کی ابتدا تھی اور زیادہ تر لوگ قصیدے لکھتے تھے جن میں امرا اور سلاطین کی مدح ہوتی تھی لیکن شاعری اور حسن و عشق کچھ لازم و ملزوم سی چیزیں ہیں چنانچہ عاشقانہ شاعری یعنی غزل کی بھی ابتدا اسی زمانہ سے ہوئی۔

اگرچہ اس وقت جو دیوان رودکی کا موجود ہے۔ اس میں غزلیں نہیں ہیں لیکن رودکی نے غزلیں لکھی تھیں اور اچھی لکھی تھیں۔ مگر ضائع ہوگئیں۔ عنصری کہتا ہے۔

غزل رودکی وار نیکو بود غزلہائے من رودکی وار نیست

اس موقع پر ہم اس کے قصاید کی تشبیب سے چند عشقیہ اشعار نقل کرتے ہیں جن سے کچھ اس کی غزلوں کی کیفیت کا اندازہ ہو سکے گا۔

رودکی

تا دل من در ہوائے نیکواں گشت آشنا در سرشک دیدہ گرداتم چو مرد آشنا

تا مرا بیند ہوا باکس نگیرد دوستی　　　تا مرا یابد بلا باکس نگردد آشنا

آں گلے بشگفت کاں برخوبرویاں سر بود　　　وز بنفشہ بر سر سرو سہیش افسر بود

شخص با جاں آں زماں باشد کہ با جاناں بود　　　مرد بادل آنزماں باشد کہ با دلبر بود

دشوار نمائی رخ و دشوار دہی بوس　　　آساں بربائی دل و آساں بری جاں

رودکی کے دوسو برس بعد تک بجز اس کے کہ زبان اور اسلوب بیان میں کسیقدر صفائی اور شستگی ہو گئی غزل میں کوئی نمایاں ترقی نہیں ہوئی۔ انوری خاقانی ظہیر وغیرہ نے قصیدہ گوئی کو معراج کمال پر پہنچا دیا زبان کو صاف کیا لیکن مدحی نے ان کو غزل گوئی کی طرف توجہ کرنے کی بہت کم فرصت دی۔

چھٹی صدی کے آخر کا وہ زمانہ تھا جس میں شاعری کا تیسرا اور آخری پیغمبر پیدا ہوا یعنی سعدی۔ یہ شخص ایک عجیب دماغ خدا کے یہاں سے لایا تھا جس کے اندر مختلف طاقتیں اور نہایت زبردست طاقتیں مجتمع تھیں۔

وہ زاہدوں میں سچا زاہد رندوں میں مست رند، منبروں پر فصیح و بلیغ خطیب اور محفلوں میں لطیف و ظریف شاعر تھا اس کے ایک ہاتھ میں آئینہ شریعت تھا اور دوسرے ہاتھ میں سندان عشق وہ کہتا ہی اور سچ کہتا ہی ؎

در کفے جام شریعت در کفے سندان عشق　　　ہر ہوسناکے نداند جام و سندان باختن

اس کے جدت پسند دماغ نے غزل گوئی کی اسی پرانی لکیر کو جس میں عشق مجازی کی کیفیت ہوتی تھی پیٹنا پسند نہ کیا۔ اس نے ایک نئی شاہراہ نکالی جو تلوار کی دھار سے بھی زیادہ تیز اور بال سے بھی زیادہ باریک تھی یعنی اس نے مجاز و حقیقت دونوں

کو باہم منطبق کر دیا اور ظاہری عشق میں تصوف اور درویشی کا نمک ملا دیا جس سے اس کے دیوان کا نام نمکداں قرار پایا۔

وہ معشوق مجازی کے رخساروں کے آئینوں میں شاہد حقیقی کی جھلک دکھاتا ہے اور زلف و خال لب و دنداں سے اس کے ازلی صفات کا نقشہ کھینچتا ہے۔ عارفین و کاملین کو رندوں اور میخواروں کے بھیس میں جلوہ گر کرتا ہے اور دف و چنگ کے پردے میں تجلیِ واردات اور صوفیانہ رموز کے نغمے گاتا ہے۔

اُس کا یہ رنگ نیا کو اس قدر پسند آیا اور اتنا مقبول عام ہوا کہ بلا استثنا تمام شعرائے اسی کی پیروی شروع کی۔ امیر خسرو[۵۰] اور امیر حسن دہلوی۔ خواجو کرمانی کمال خجندی اور سلمان ساوجی وغیرہ الغرض جس قدر شعرا شیخ کے بعد ہوئے سب نے اسی کی شاہراہ اختیار کی اور اسی کے قدم بقدم چلنا شروع کیا۔ امیر خسرو کہتے ہیں ؎

خسرو سرمست اندر ساغر معنی بریخت　　شیرہ از خمخانۂ مستی کہ در شیراز بود

لیکن جو رنگ شیخ نے ایجاد کیا تھا اس میں کوئی اس کی برابری نہ کر سکا تھا گو اس کے پیروں میں امیر خسرو سب سے آگے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ شیخ کے کلام کو ان کا کلام نہیں پہنچ سکتا امیر خسرو کے اشعار میں سادگی۔ دل آویزی اور گرمی سب باتیں سہی لیکن نہ اس قدر جتنی کہ شیخ کے کلام میں ہیں۔

شیخ کی وفات کے تقریباً نصف صدی بعد خواجہ حافظ کی شاعری کا زمانہ آیا۔

۵۰ امیر خسرو دہلوی مشہور شاعر ہیں۔ متوفی ۷۲۵ھ۔ امیر حسن دہلوی بھی۔ امیر خسرو کے دوست تھے انھوں نے ۷۲۸ھ میں وفات پائی۔ کمال خجندی ایک صوفی شاعر تھے تبریز میں سکونت اختیار کر لی تھی ۸۰۳ھ میں وفات پائی۔

جنھوں نے اس کے لگائے ہوئے چمن کو ایسا آراستہ و پیراستہ کیا کہ وہ جنت کا نمونہ بنگیا اور اس کے پودھوں کی شاخوں کو آسمان تک پہنچا دیا۔

ہمارے سامنے اس وقت ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری کے تمام بڑے بڑے شعرائے کے دیوان رکھے ہوئے ہیں۔ جب ہم ان کو پڑھتے ہیں اور پھر خواجہ کے دیوان کو اُٹھا کر دیکھتے ہیں تو زمین و آسمان کا فرق نظر آتا ہی حقیقت میں کپتان کلارک کا کا یہ کہنا نہایت صحیح ہو کہ "خواجہ ایک ایسے شاعر ہیں جن کا موازنہ دنیا کے کسی شاعر کے ساتھ نہیں کیا جا سکتا"

امیر خسرو۔ خواجہ سلمان۔ کمال خجندی ان لوگوں کا کمال اسی وقت تک نظر آتا ہی۔ جب تک کہ خواجہ حافظ کے مقابلہ میں نہ لائے جائیں۔

خواجہ کے کلام کا ان لوگوں کے کلام کے ساتھ موازنہ کرنا دراصل خواجہ کی ہتک اور تحقیر ہی۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ ہم دوسرے شعرائے کے کلام کو اچھا نہیں سمجھتے اور ان پر عیب گری کرتے ہیں ؎

ماعیب کس بزندی و مستی نمی کنیم　　　لعل بتاں خوشست و مے خوشگوار ہم

لیکن یہ ایک واقعہ ہی جس کے بیان کرنے پر ہم مجبور ہیں چاند کی روشنی نہایت دلفریب ہی لیکن اسی وقت تک جب تک کہ سورج نہو۔

سلمان ساوجی اور کمال خجندی خواجہ کے بیحد قائل تھے اور دونوں اپنی اچھی اچھی غزلوں کو خواجہ کے پاس بھیجا کرتے تھے کمال خجندی نے ایک مرتبہ یہ غزل جو ان کو بہت پسند تھی خواجہ کے پاس بھیجی۔

گفت یار از غیر ما پوشاں نظر گفتم بچشم　　　واں گہے دزدیدہ در ما مینگر گفتم بچشم

گفت اگر سر در بیابان غم خواہی نہاد — تشنگان افسردہ از ما بیر گفتم بچشم

گفت اگر یابی نشان پائے ما بر خاک را — بر نشان آنجا بد منہا گفتم بچشم

گفت اگر گرد و لبت خشک از دم سوزان آہ — باز میاں زش چون شمع از گریہ تر گفتم بچشم

گفت اگر گردی شبے از رشتے چون ماہ جدا — تا سحر گاہاں ستارہ بر شمر گفتم بچشم

گفت اگر داری خیال دُر وصل ما کمال

قعر ایں دریا بہ پیما سر بسر گفتم بچشم

خواجہ نے اس مصرعہ "تشنگاں را افسردہ از ما بیر گفتم بچشم" کو بہت پسند فرمایا اور تعریف کی ایسے ذرا خواجہ کا دیوان اُٹھا کر دیکھئے بہت تلاش کرنے سے شاید اس میں کوئی ایسی غزل مل سکے گی جو اس سے اونچے درجہ کی ہو۔

الغرض اصلی غزل کی ایجاد شیخ نے کی۔ اور اس کی تکمیل خواجہ پر ہوگئی۔

شیخ کا قول ہے ؎

زلطف لفظ شکر بار گفتہ سعدی — شدم غلام ہمہ شاعران شیرازی

خواجہ بھی شیخ کی اُستادی کو تسلیم کرتے ہیں ؎

استاد غزل سعدی ست پیش ہمہ کس اما — دارد سخن حافظ طرز سخن خواجو

خواجہ نے ابتدا میں خواجو کی صحبت سے فیض حاصل کیا تھا۔ اس موقع پر اسی کی شکر گزاری کرتے ہیں ورنہ آج خواجو کو کون جانتا ہے۔

الغرض سعدی کے بعد غزل گوئی میں اگر کوئی پیش کیا جا سکتا ہے تو وہ حافظ ہے اور حافظ کی غزلوں کے مقابلہ میں اگر کسی کی غزلیں لائی جا سکتی ہیں تو سعدی کی فارسی غزل گوئی کے یہی دونوں بڑے رُکن ہیں۔ ایک موجد ہے دوسرا

اس کو درجہ کمال پر پہنچانے والا ہی اہلی شیرازی کہتا ہے ؎

عقل و فہم شاعران زعجز و حیرت آورند　　سعدی معجز بیان و حافظ سحر آفرین

اگرچہ ہم اس بات کو خوب جانتے ہیں کہ ہر ایک شاعر کی شعر گوئی کی اصلی کیفیت اسی وقت معلوم ہوتی ہے جب اس کا دیوان مطالعہ کیا جائے۔ مگر اس موقع پر ہم سعدی اور حافظ کے بعض ہم مضمون اشعار اس لیے پیش کرتے ہیں تاکہ کچھ کچھ ان کے اسلوب بیان کا اندازہ ہو سکے۔

حافظ نے کہیں تو سعدی کے بعض مصرعے بجنسہ لے لیے ہیں اور ان پر اپنا مصرع لگاکر شعر کو قطرہ سے موتی بنا دیا ہے اور کہیں دونوں کے اشعار کا مضمون ملگیا ہے۔

سعدی　بدم گفتی و خرسندم عفاک اللہ نکو گفتی　　سگم خواندی و خوشنودم جزاک اللہ کرم کردی

حافظ　بدم گفتی و خرسندم عفاک اللہ نکو گفتی　　جواب تلخ می زیبد لب لعل شکر خارا

شیخ کے دونوں مصرعوں میں ایک ہی بات تھی خواجہ نے پہلا مصرعہ بجنسہ لے لیا اور اس پر اپنا دوسرا مصرع لگاکر شعر کو زمین سے آسمان تک پہنچا دیا۔

سعدی　جز این قدر نتوان گفت در جمال تو عیب　　کہ مہربانی ازاں طبع و خو نمے آید

حافظ　جز این قدر نتوان گفت در جمال تو عیب　　کہ خال مہر و وفا نیست روئے زیبا را

شیخ نے یار کے جمال میں یہ عیب نکالا کہ اس کی طبیعت میں مہربانی نہیں ہے۔ لیکن جمال سے حسن ظاہری مراد ہے اور طبیعت کی مہربانی ایک باطنی چیز ہے۔ خواجہ نے اس نکتہ کو محسوس کر لیا اور اس باطنی صفت کو بھی اُنھوں نے ظاہری شکل میں لاکر یوں کہا کہ اس خوبصورت چہرے پر مہر و وفا کا تل نہیں ہے۔

سعدی　اے کہ منعم کنی از عشق و ملامت گوئی　　تو نبودی کہ من این جام محبت خوردم

حافظ منعم کنی ز عشق وے اے مفتیٔ زماں ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ معذور دارمت کہ تو او را ندیدۂ

شیخ کہتا ہی کہ عشق سے مجھے روکنا اور ملامت کرنا فضول ہی کیوں کہ جام عشق میں نے ازل ہی میں پیا ہی اور مشیت ازلی یہی تھی خواجہ کہتے ہیں کہ اے مفتیٔ زمانہ تو جو مجھے عشق سے منع کرتا ہی تو میں تجھے معذور سمجھتا ہوں کیوں کہ تو نے اس حسن کو دیکھا ہی نہیں یہ مضمون انسانی فطرت کے مطابق اور دلنشیں ہی۔

سعدی من از کجا و تمنائے وصل تو زکجا ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ اگرچہ آب حیاتی ہلاک خود جستم

حافظ تو از کجا و امید وصال او ز کجا ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ بدامنش نرسد دست ہر گدا حافظ

شیخ کہتا ہی کہ میں تیرے وصل کی کیونکر تمنا کر سکتا ہوں تو اگرچہ آب حیات ہے لیکن میرے لیے مہلک ہی۔ دونوں مصرعوں کا جوڑ کچھ ٹھیک ملا نہیں بخلاف اس کے خواجہ کہتے ہیں کہ حافظ تو کہاں اور اُس کے وصل کی امید کہاں تو ایک فقیر ہی اور وہ بادشاہ ہی ہر فقیر کا ہاتھ اس کے دامن تک نہیں پہنچ سکتا۔

سعدی آں نہ خالست و زنخدان و سر زلف پریشاں ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ کہ دل اہل نظر بردہ کہ سریست خدائی

حافظ لطیفہ ایست نہانی کہ عشق ازو خیزد ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ کہ نام آں نہ لب لعل و خط زنگاریست

مضمون دونوں ایک ہی بیان کرنا چاہتے ہیں کہ معشوق کے زلف و لب و رخسار و خال پر اہل نظر عاشق نہیں ہوتے بلکہ اُن کو ان میں کسی اور چیز کی جھلک نظر آتی ہی جس پر وہ فریفتہ ہوتے ہیں۔ مگر دونوں کا طرز بیان الگ الگ ہی۔ سعدی نے صاف صاف اس کو کہہ دیا کہ "سریست خدائی" حافظ نے کنایہ میں کہا کہ "لطیفہ ایست نہانی" وہی بات ہی مگر حافظ نے اس کو زیادہ لطیف پیرایہ میں کہا۔

سعدی یارب تو آشنا را مہلت دہ و سلامت ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ چندانکہ باز بیند دیدار آشنا را

حافظ کشتی شکستگانیم اے باد شرطہ برخیز　　باشد کہ باز بینیم آں یار آشنا را

مہلت اور سلامتی مانگنے کے لیئے قید مصیبت کا بیان کر دینا بھی ضروری تھا۔ خواجہ نے ظاہر کیا کہ ہم کشتی شکستہ ہیں۔

خواجہ نے اپنے اس شعر کا مضمون درحاصل خواجہ عبید اللہ انصاری رح متوفی ۴۸۱ھ کے اس شعر سے لیا ہی۔

کشتی شکستہ حسبت کز روح باز ماند　　تا نفخ صور جوید آمرزش خدا را

مگر یہ مضمون محض صوفیانہ تھا خواجہ نے اس کو اپنے رنگ کا بنا لیا۔

انسان کے آخری فیصلہ کی کیفیت کو جبکہ وہ طے کر لیتا ہی کہ یا جان دیدونگا یا مقصد حاصل کرونگا نظامی نے اپنے بہادرانہ لہجے میں اس طرح ادا کیا ہی ؎

من آں گہ عناں باز پیچم ز راہ　　کہ یا سر دہم یا ستانم کلاہ

میں راستہ سے اس وقت اپنی لگام پھیرونگا کہ یا سر دیدوں یا تاج لے لوں

سعدی نے عاشقانہ انداز میں یوں کہا۔

تا چہ خواہد کرد با من دور گیتی زین دو کار　　دست او در گردنم یا خون من بر گردنش

دیکھنا چاہیئے کہ زمانہ کی گردش ان دونوں کاموں میں سے کونسا کام میرے ساتھ کرتی ہی اسکے ہاتھ میری گردن میں پڑتے ہیں یا

حافظ کہتے ہیں ؎

او بخونم تشنہ و من بر لبش تا چوں شود　　کام بستانم ازو یا داد او بستاند ز من

وہ میرے خون کا پیاسا ہی اور میں اسکے لبوں کا۔ دیکھنا چاہیئے کہ کیا ہوتا ہی میں اس سے اپنا مطلب حاصل کرتا ہوں یا وہ مجھے قتل کرتا ہی

سعدی کے شعر میں یہ کمی تھی کہ اُنھوں نے پہلے مصرعہ میں اپنے طلب اور کوشش کی کوئی کیفیت نہیں بیان کی حافظ نے ایک حد تک اس کمی کو پورا کیا۔ لیکن انتخاب

ان میں سے کسی میں یہ خوبی نہیں پیدا ہوئی تھی کہ وہ ضرب المثل بنتا خواجہ نے دوسرے شعر میں اسی مضمون کو نہایت خوبی کے ساتھ اس طرح ادا کیا ؎

دست از طلب ندارم تا کام من برآید — یا تن رسد بجاناں یا جاں ز تن برآید

اب ہر طرح یہ مضمون مکمل ہو گیا۔ اور مذاق عام کی روح میں حلول کر جانے کی قابلیت اس میں پیدا ہو گئی چنانچہ یہ ضرب المثل ہو گیا الغرض سعدی اور حافظ کے طرز ادا میں بے انتہا فرق ہے چند اشعار اور ملاحظہ ہوں۔

سعدی عمرہا در پئے مقصود بجاں گردیدیم — دوست در خانہ و ما گرد جہاں گردیدیم
حافظ سالہا دل طلب جام جم از ما میکرد — آنچہ خود داشت ز بیگانہ تمنا میکرد

سعدی کجا خود شکر ایں نعمت گذارم — کہ زور مردم آزاری ندارم
حافظ من از بازوئے خود دارم بسے شکر — کہ زور مردم آزاری ندارم

سعدی ہر کس از دست غیر نالہ کند — سعدی از دست خویشتن فریاد
حافظ من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم — کہ با من انچہ کرد آں آشنا کرد

سعدی مردہ از خاک لحد رقص کناں برخیزد — گر تو بالائے عظامش گذری عظم رمیم
حافظ بر سر تربت من بے مے و مطرب منشیں — تا بہ بوئیت ز لحد رقص کناں برخیزم

سعدی بخدا کہ گر بمیرم کہ دل از تو بر نگیرم — برو اے طبیب از سرکہ دوا نمی پذیرم

حافظ بر و لے طبیب از سر کہ خیال سر ندارم　　بخدا رہا کنم جاں کہ زجاں خبر ندارم

کنار سعدی از آں روز کز تو دور افتاد　　ز آب دیدہ تو گوئی کہ رود جیحونست

حافظ از آں زماں کہ ز دستم برفت یار عزیز　　کنارہ دیدہ من ہمچو رود جیحونست

سعدی عرقت بر ورق روئے نگاریں بچہ ماند　　ہمچوں بر صفحۂ گل قطرہ باران بہاری

حافظ از تاب آتش مے برگرد عارضش خوے　　چو قطرہائے شبنم بر برگ گل چکیدہ

سعدی بیحاصلست یارا - اوقات زندگانی　　الا دمیکہ یارے با ہمدمے گذارد

حافظ اوقات خوش آں بود کہ با دوست بسر شد　　باقی ہمہ بیحاصلی و بے خبری بود

سعدی اگر چہ خاطرت با ہر کسے پیوند ہا دارد　　مبادا آں روز و آں ساعت کہ من جز با تو پیوندم

حافظ اگر بر جائے من غیرے گزیند دوست حاکم اوست　　حرامم باد اگر من جاں بجائے دوست بگزینم

سعدی بندہ ام گر بلطف میخوانی　　چاکرم گر بقہر میرانی

حافظ اگر بلطف بخوانی مزید الطافست　　وگر بقہر برانی درون ما صافست

سعدی عروس ملک نکو روئے دختریست ولے　　وفا نمی کند ایں سست مہر با داماد

حافظ مجو درستی عہد از جہان سست نہاد　　کہ ایں عجوزہ عروس ہزار داماد ست

سعدی بتماشائے درخت چمنش حاجت نیست — آنکہ در خانہ چو تو سرو روانے دارد

حافظ مرا در خانہ سروے ہست کاندر سایۂ قدش — فراغ از سرو بستانی و گلہائے چمن دارم

سعدی از ورطۂ ما خبر ندارد — آسودہ کہ بر کنار دریاست

حافظ شب تاریک و بیم موج و گردابے چنیں ہائل — کجا دانند حال ما سبکساران ساحلہا

سعدی نہ من خام طمع عشق تو میورزم و بس — کہ چو من سوختہ در خیل تو بسیار ہست

حافظ نہ من برآں گل عارض غزل سرایم و بس — کہ عندلیب تو از ہر طرف ہزار انند

سعدی فارسی زبان کا پیغمبر ہے۔ اسلوب بیان کا بادشاہ ہے۔ اس کی گلستاں کی نثر کے ایک ایک فقرے دوسرے شعراء کے ایک ایک دیوان پر بھاری ہیں۔ لیکن دیکھئے معنوی خوبیوں میں لفظوں کی شیرینی اور فصاحت میں طرز ادا اور اسلوب بیان کی جدت اور لطافت میں حافظ کس قدر اس سے بلند ہے!!

مولانا حالی کہتے ہیں۔

"جن اصول پر شیخ نے غزل کی بنیاد رکھی تھی اس کے بعد اکثر متغزلین نے وہی اصول اختیار کیئے کیوں کہ ان کے بغیر غزل کا سرسبز ہونا نہایت دشوار تھا اور اس طرح رفتہ رفتہ تمام ایران ترکستان اور ہندوستان میں ایک آگ سی لگ گئی ہر موزوں طبع نے غزل کہنی اختیار کی اور غزل گویوں کی تعداد حساب اور شمار سے بڑھ گئی۔ ازانجملہ بعض اکابر کی غزل نے شیخ سے بھی زیادہ شہرت اور رواج پایا۔ علی الخصوص حافظ شیراز کی غزل نے اپنا وہ سکہ جمایا

کہ مذکورہ بالا ملکوں میں جو لوگ شعر کا مذاق رکھتے تھے یا فقر و درویشی کی چاشنی سے باخبر تھے یا راگ راگنی سے آشنا تھے یا شراب و کباب کا چسکا رکھتے تھے۔ یا عاشق مزاج اور عشق دوست تھے سب جان و دل سے اُس پر قربان ہو گئے۔ رقص و سرود کی محفلوں میں حال و قال کی مجلسوں میں۔ قہوہ خانوں میں شعراء کی صحبتوں میں مشائخ کے حلقوں میں در و دیوار سے لسان الغیب ہی کی آواز آنے لگی۔"

کلام کا نمونہ

فارسی کی تمام شاعری کا اگر انتخاب کیا جائے تو اچھے اور عمدہ اشعار اتنے نہ نکل سکیں گے جتنے صرف دیوان حافظ میں نکلیں گے دیوان حافظ کے تمام اشعار شروع سے آخر تک (سوائے الحاقی غزلوں کے) بے مثل اور لاجواب ہیں ؎

انچہ ابیات بلندست کہ از طبعش زاد ۔۔۔ انتخابیست ز دیوان سخن بخش ازل

ولیم جونس کہتا ہے کہ

حافظ کا دیوان اس چمن سے مشابہ ہے جس میں انسان اگر ایک پھول کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے تو دوسرے پھول کا رنگ اور تازگی دیکھکر اس کو توڑنے کو جی چاہتا ہے۔ اور جب اسکی طرف لپکتا ہے تو تیسرے کی شگفتگی اور خوبصورتی سفارش کرتی ہے کہ مجکو توڑو۔ گلچین متحیر اور مبہوت رہجاتا ہے کہ کس کو توڑے اور کسکو نہ توڑے۔

یہ ممکن ہے کہ اپنی طبیعت کے مذاق کے مطابق کسی کو ایک غزل دوسری سے زیادہ پسند آئے لیکن بحیثیت نفس شاعری کے دیوان حافظ کا انتخاب نہیں ہو سکتا بہت سے لوگوں نے

انتخابات کیے ہیں لیکن وہ ایک دوسرے سے نہیں ملتے۔ ایک نے جو غزلیں چھوڑ دی ہیں دوسرے نے وہی منتخب کی ہیں۔ صائب کہتا ہے ع

کہ شعر حافظ شیراز انتخاب ندارد

ہم کو اس انتخاب پر ایک واقعہ یاد آیا کئی سال کا عرصہ ہوا ایک دفعہ ہم قنوج سے گذرے دل نے کہا اکثر یہاں سے عطر منگواتے ہیں۔ کارخانہ والے جیسا چاہتے ہیں اٹھا کر بھیجدیتے ہیں اب تو یہاں آہی گئے ہیں لاؤ ایک دن کے لیئے ٹھہر جائیں اور خود کارخانہ میں چلکر اپنی پسند کے موافق دوستوں کے لیئے عطر کی شیشیاں خریدیں۔ ٹھہر گئے۔ شام کے وقت ایک بڑے کارخانے میں پہنچے۔ وہاں جانے کے ساتھ ہی۔ اس قدر خوشبو دماغ میں بسگئی کہ اچھا اور برا پہچاننا تو درکنار کیوڑے اور گلاب میں امتیاز کرنا مشکل ہو گیا۔ آخر کارخانہ والوں نے جو شیشی اُٹھا کر دیدی وہی لیلی۔

دیوان حافظ دیکھتے وقت بھی قوت انتخاب دماغ سے بالکل جاتی رہتی ہے۔ تمام تذکرہ نویس اس سے انتخاب کرنے کو بے ادبی سمجھتے ہیں ہم اس موقع پر بلا انتخاب چند غزلیں جو ہمارے ملک کے لوگوں میں عام طور پر مشہور ہیں درج کرتے ہیں۔

الا یا ایہا الساقی ادر کاساً وناولہا ۔۔۔ کہ عشق آسان نمود اول ولے افتاد مشکلہا

بمے سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید ۔۔۔ کہ سالک بیخبر نبود زراہ و رسم منزلہا

مرا در منزل جاناں چہ امن عیش چوں ہر دم ۔۔۔ جرس فریاد بردارد کہ بربندید محملہا

شب تاریک و بیم موج و گردابے چنیں ہائل ۔۔۔ کجا دانند حال ما سبکباران ساحلہا

ببوئے نافہ کاخر صبا زاں طرہ بکشاید ۔۔۔ زتاب جعد مشکینش چہ خوں افتاد در دلہا

ہمہ کارم زخود کامی بہ بدنامی کشید آخر ۔۔۔ نہاں کے ماند آں رازے کزو سازند محفلہا

حضوری گر ہمی خواہی ازو غائب مشو حافظ
متی ما تلق من تہوی دع الدنیا و اہملہا

دل میرود ز دستم صاحبدلاں خدارا
دردا کہ راز پنہاں خواہد شد آشکارا

دہ روزہ مہر گردوں افسانہ ایست افسوں
نیکی بجائے یاراں فرصت شمار یارا

کشتی شکستگانیم اے باد شرطہ برخیز
باشد کہ باز بینیم آں یار آشنا را

در حلقۂ گل و مل خوش خواند دوش بلبل
ھات الصبوح ھبوا یا ایہا السکارا

اے صاحب کرامت شکرانۂ سلامت
روزے تفقدے کن درویش بے نوا را

آسایش دو گیتی تفسیر ایں دو حرف است
با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا

در کوئے نیک نامی ما را گزر ندادند
گر تو نمے پسندی تغییر کن قضا را

آئینۂ سکندر جام جم است بنگر
تا بر تو عرضہ دارد احوال ملک دارا

ہنگام تنگدستی در عیش کوش و مستی
کیں کیمیائے ہستی قاروں کند گدا را

گر مطرب حریفاں ایں پارسی بخواند
در رقص و حالت آرد پیران پارسا را

حافظ بخود نپوشید ایں خرقۂ مے آلود
اے شیخ پاکدامن معذور دار ما را

اگر آں ترک شیرازی بدست آرد دل ما را
بخال ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را

بدہ ساقی مے باقی کہ در جنت نخواہی یافت
کنار آب رکناباد و گلگشت مصلی را

فغاں کیں لولیان شوخ و شیریں کار شہر آشوب
چناں بردند صبر از دل کہ ترکاں خوان یغما را

ز عشق ناتمام ما جمال یار مستغنی است
بآب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبا را

من از آں حسن روز افزوں کہ یوسف داشت دانستم
کہ عشق از پردۂ عصمت بروں آرد زلیخا را

حدیث از مطرب و می گو و راز دهر کمتر جو | که کس نگشود و نگشاید بحکمت این معما را

نصیحت گوش کن جانا که از جان دوست‌تر دارند | جوانان سعادتمند پند پیر دانا را

بدم گفتی و خرسندم عفاک الله نکو گفتی | جواب تلخ میزیبد لب لعل شکرخا را

غزل گفتی و در سفتی بیا و خوش بخوان حافظ
که بر نظم تو افشاند فلک عقد ثریا را

صبا بلطف بگو آن غزال رعنا را | که سر بکوه و بیابان تو داده‌ٔ ما را

شکرفروش که عمرش دراز باد چرا | تفقدے نکند طوطی شکرخا را

غرور حسن اجازت مگر نداد اے گل | که پرسشی نکنی عندلیب شیدا را

بحسن خلق توان کرد صید اہل نظر | به بند و دام نگیرند مرغ دانا را

چو با حبیب نشینی و باده پیمائی | بیاد آر حریفان بادپیما را

ندانم از چه سبب رنگ آشنائی نیست | سهی قدان سیه چشم ماه سیما را

جز این قدر نتوان گفت در جمال تو عیب | که خال مهر و وفا نیست روے زیبا را

در آسمان چه عجب گر ز گفتهٔ حافظ
سماع زهره برقص آورد مسیحا را

رسید مژده که ایام غم نخواهد ماند | چنان نماند و چنین نیز هم نخواهد ماند

من ار چه در نظر یار خاکسار شدم | رقیب نیز چنین محترم نخواهد ماند

غنیمتی شمر اے شمع وصل پروانه | که این معامله تا صبحدم نخواهد ماند

سروش عالم غیبم بشارتے خوش داد | که بر در کرمش کس دژم نخواهد ماند

برین رواق زبرجد نوشته‌اند بزر | که جز نکوئی اہل کرم نخواهد ماند

چه جای شکر و شکایت ز نقش نیک و بد است | که نقش مهر و نشان ستم نخواهد ماند

ز مهربانی جانان طمع مبر حافظ

که کس همیشه گرفتار غم نخواهد ماند

غلام نرگس مست تو تاجدارانند | خراب بادهٔ لعل تو هوشیارانند

ترا صبا و مرا آب دیده شد غماز | وگرنه عاشق و معشوق رازدارانند

گذار کن چو صبا بر بنفشه زار و ببین | که از تطاول زلفت چه سوگوارانند

رقیب در گذر و بیش ازین مکن نخوت | که ساکنان در دوست خاکسارانند

نصیب ماست بهشت ای خداشناس برو | که مستحق کرامت گناهکارانند

نه من بر آن گل عارض غزل سرایم و بس | که عندلیب تو از هر طرف هزارانند

تو دستگیر شو ای خضر پی خجسته که من | پیاده میروم و همرهان سوارانند

بیا بمیکده و چهره ارغوانی کن | مرو بصومعه کانجا سیاه کارانند

خلاص حافظ ازان زلف تابدار مباد

که بستگان کمند تو رستگارانند

نه هر که چهره برافروخت دلبری داند | نه هر که آینه سازد سکندری داند

نه هر که طرف کله کج نهاد و تند نشست | کلاه داری و آیین سروری داند

هزار نکتهٔ باریک تر ز مو اینجاست | نه هر که سر بتراشد قلندری داند

در آب دیدهٔ خود غرقه ام چه چاره کنم | که در محیط نه هر کس شناوری داند

بباختم دل دیوانه و ندانستم | که آدمی بچهٔ شیوهٔ پری داند

وفای عهد نکو باشد ار بیاموزی | وگرنه هر که تو بینی ستمگری داند

تو بندگی چو گدایاں بشرط مزد مکن — کہ خواجہ خود روش بندہ پروری داند

ز شعر دلکش حافظ کسے شود آگاہ

کہ لطف طبع و سخن گفتن دری داند

واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبر می کنند — چوں بخلوت میروند آں کار دیگر می کنند

مشکلے دارم ز دانشمند مجلس باز پرس — توبہ فرمایاں چرا خود توبہ کمتر میکنند

گوئیا باور نمیدارند روز داوری — کیں ہمہ قلب و دغل در کار داور میکنند

بندۂ پیر خراباتم کہ درویشان او — گنج را از بے نیازی خاک بر سر میکنند

اے گدائے خانقہ باز آ کہ در دیر مغاں — مے دہند آبے و دلہا را توانگر میکنند

حسن بے پایان او چندانکہ عاشق میکشد — زمرۂ دیگر بعشق از غیب سر بر میکنند

خانہ خالی کن دلا تا منزل جاناں شود — کیں ہوسناکاں دل و جاں جائے دیگر میکنند

آہ آہ از دست صرافان گوہر ناشناس — ہر زماں خر مہرہ را با در برابر میکنند

بر در میخانۂ عشق اے ملک تسبیح گوئے — کاندر آنجا طینت آدم مخمر مے کنند

صبحدم از عرش مے آمد خروشے عقل گفت

قدسیاں گوئی کہ شعر حافظ از بر میکنند

یوسف گم گشتہ باز آید بکنعاں غم مخور — کلبۂ احزاں شود روزے گلستاں مخور

اے دل غمدیدہ حالت بہ شود دل بد مکن — ویں سر شوریدہ باز آید بساماں غم مخور

دور گردوں گر دو روزے بر مراد ما نگشت — دائما یکساں نباشد حال گردوں غم مخور

ہاں مشو نومید چوں واقف نئی از سر غیب — باشد اندر پردہ بازی ہائے پنہاں غم مخور

ہر کہ سرگرداں بعالم گشت و غمخوارے نیافت — آخر الامر او بغمخوارے رسد ہاں غم مخور

در بیاباں گر بشوق کعبہ خواہی زد قدم — سرزنشہا گر کند خار مغیلاں غم مخور

گرچہ منزل بس خطرناکست و مقصد ناپدید — ہیچ راہے نیست کو را نیست پایاں غم مخور

حافظا در کنج فقر و خلوت شبہاے تار

تا بود وردت دعا و درس قرآں غم مخور

مطرب خوش نوا بگو تازہ بتازہ نو بنو — بادہ دلکشا بجو تازہ بتازہ نو بنو

با صنمے چوں لعبتے خوش بنشیں بخلوتے — بوسہ ستاں بکام از و تازہ بتازہ نو بنو

ساقی سیم ساق من نیست ہیم بیا بپیش — زود کہ پر کنم سبو تازہ بتازہ نو بنو

بر ز حیات کے خوری گر نہ مدام مے خوری — بادہ بخور بیاد او تازہ بتازہ نو بنو

شاہد دلربائے من میکند از برائے من — نقش و نگار و رنگ و بو تازہ بتازہ نو بنو

باد صبا چو بگذری بر سر کوئے آں پری

قصہ حافظش بگو تازہ بتازہ نو بنو

ایں خرقہ کہ من دارم در رہن شراب اولے — ویں دفتر بے معنی غرق مے ناب اولے

چوں عمر تبہ کردم چندانکہ نگہ کردم — در کنج خراباتے افتادہ خراب اولے

چوں مصلحت اندیشی دورست ز درویشی — ہم سینہ پر آتش بہ ہم چشم پر آب اولے

از ہمچو تو دلدارے دل بر نہ کنم آرے — گر تاب کشم بارے زاں زلف بتاب اولے

من حال دل زاہد با خلق نخواہم گفت — ویں قصہ اگر گویم با چنگ و رباب اولے

تا بے سر و پا باشد اوضاع جہاں زینساں — در سر ہوس ساقی۔ در دست شراب اولے

چوں پیر شدی حافظا از میکدہ بیروں شو

رندی و ہوسناکی۔ در عہد شباب اولے

خواجہ کے کلام کی مقبولیت

حسد چہ میبری اے سست طبع بر حافظ — قبول خاطر و لطف سخن خداداد است

خواجہ کی غزلیں جس ذوق شوق کے ساتھ جنوبی ہند میں گائی جاتی ہیں اسی جوش خروش کے ساتھ ترکستان کے میدانوں میں انکا راگ گونجتا ہے۔ اور جس طرح دریائے گنگا کے کناروں پر اس کے نغمے اُٹھتے ہیں۔ اسی طرح دریائے ڈینیوب کی موجوں سے اس کے راگ ٹکراتے ہیں۔

گو خواجہ کو گذرے ہوئے آج پانچسو سال سے زیادہ ہو گئے لیکن ان کی غزلیں ابتک ویسی ہی دلکش اور دلفریب ہیں جیسی پہلے تھیں اور اتنی صدیاں گذرنے پر بھی انکی مقبولیت کی نوجوانی پر کسی قسم کا بڑھاپا نہیں چھایا۔ کیونکہ ان کی بنیاد فطرتی جذبات پر ہے۔ یعنے ان جذبات پر جو ہر قوم۔ ہر ملک اور ہر طبقہ کے آدمیوں میں ایکساں پائے جاتے ہیں اس لیے اس کی ہر دلعزیزی میں اس وقت تک فرق نہیں آسکتا جب تک کہ انسان کی فطرت نہ بدل جائے۔

خاص فارس میں تو اس کی مقبولیت کی کوئی انتہا نہیں ہے بادشاہوں اور امرار کے درباروں۔ فقرا اور درویشوں کے جھگھٹوں۔ عوام الناس اور بازاریوں کی محفلوں غرض ہر طبقہ اور ہر درجہ کے لوگوں میں وہ ایکساں مقبول ہے۔ بچہ بچہ کو سینکڑوں شعر ازبر ہوتے ہیں عورتیں غزلیں کی غزلیں یاد رکھتی ہیں اور گاتی ہیں۔ میڈم لوئیسا لکھتی ہے۔ کہ فارسی کی ایک کتاب "کلثوم ننہ" ہے جس میں وہاں کی مستورات کے مذاقیہ من گھڑت رسم ورواج کے مسئلے لکھے ہوئے ہیں منجملہ انکے ایک یہ بھی ہے۔

"ہر ایک عورت کے لیئے لازم ہے کہ طنبورہ بجانا سیکھے۔ تاکہ اس کے ذریعے سے طبیعت کی افسردگی اور کلفت کو دور کرسکے۔ اور اس پر حافظ کی غزلیں گائے اگر ایسا اتفاق ہو کہ طنبورہ کسی گھر میں نہ ہو تو صینی یا لکڑی کے کسی تختہ کو بجائے اور گائے" اگر یہ بھی نہیں ہے تو اپنے ہاتھ کہیں نہیں گئے۔ تالیاں ہی سہی"۔ [۱]

ہم کو تواریخ میں بعض بعض ایسے آدمیوں کے نام بھی ملتے ہیں جن کو خواجہ کا پورا دیوان حفظ تھا مولانا آزاد لکھتے ہیں کہ موالی لاری جو علامہ دوانی کے شاگرد تھے خواجہ حافظ کا پورا دیوان ازبر رکھتے تھے۔

خواجہ نے سچ کہا ہے۔

حافظ حدیث عشق تو از بسکہ دلکش است ۔۔۔ نشنید کس کہ از سر رغبت ز بر نکرد

مگر ع

قدر زر زرگر بداند قدر جوہر جوہری

سب سے زیادہ خواجہ کے کلام کی قدر جس نے کی وہ فارس کے شعرا کا گروہ ہے۔ اُنھوں نے اس کے راستہ میں خلوص اور عقیدتمندی کا فرش بچھایا اس پر مدح و ثنا کے پھول برسائے اعزاز و احترام کے صدر پر اس کو بٹھایا اور اس کی پرستش شروع کی۔ ان کی سیکڑوں غزلوں پر تضمینیں کیں۔ انھیں کی روش اختیار کرنے کی کوشش کی

[۱] ہم نے یہ کتاب بڑی جستجو سے حاصل کی۔ چھوٹا سا رسالہ ہے۔ شروع سے آخر تک بار بار پڑھا۔ یہ ہدایت اس کتاب میں ضرور ہے لیکن حافظ کی غزل کا ذکر کہیں بھی ہم کو اس کتاب میں نہیں ملا مگر اس میں شبہہ نہیں کہ فارس کی عورتیں حافظ کی غزلیں گاتی ہیں۔

اور انہیں کے قدم بقدم چلنا شروع کیا بابا فغانی۔ صائب۔ نظیری۔ عرفی۔ اور تمام شعرا جو خواجہ کے بعد ہوئے ہیں ان کے دواوین کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہی کہ ہر ایک نے اپنے پیش نظر خواجہ ہی کو رکھا ہی اور انہیں کا تتبع کرنا چاہتا ہی مگر حقیقت یہ ہی کہ بقول خواجہ کے ؎

کسیکہ منطق حافظ طمع کند در شعر | ہماں حکایت زرد و زد و بوریا بافست

زمین و آسمان کا فرق ہی۔

خواجہ کے کلام کی مقبولیت کا ایک ادنی نمونہ یہ ہی کہ ہندوستان میں جہاں فارسی زبان بولی نہیں جاتی سینکڑوں شعر ان کے بطور ضرب المثل کے استعمال کیے جاتے ہیں۔ ہم اس موقع پر وہ اشعار درج کرتے ہیں جو بہت مشہور ہیں اور اردو لکھنے بولنے میں عام طور پر لوگ ان کا استعمال کرتے ہیں۔

بے سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید | کہ سالک بے خبر نبود زراہ و رسم منزلہا

آسایش دو گیتی تفسیر این دو حرفست | با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا

ز عشق ناتمام ما جمال یار مستغنی ست | باب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روی زیبا را

راز درون پردہ ز رندان مست پرس | کیں حال نیست زاہد عالی مقام را
ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق | ثبت ست بر جریدۂ عالم دوام ما

گرچه بدنامی ست نزد عاقلاں — ما نمی خواهیم ننگ و نام را

مباش در پے آزار و هرچه خواهی کن — که در شریعت ما غیر ازیں گناهی نیست

چو بشنوی سخن اهل دل مگو که خطاست — سخن شناس نئی دلبرا خطا اینجاست

دور مجنوں گذشت و نوبت ماست — هر کسے پنج روز نوبت اوست

پری نهفته رخ و دیو در کرشمه و ناز — بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چه بوالعجبیست

مصلحت نیست که از پرده بروں افتد راز — ورنه در مجلس رنداں خبرے نیست که نیست

هر چه هست از قامت ناساز بے اندام ماست — ورنه تشریف تو بر بالاے کس کوتاه نیست

رواق منظر چشم من آشیانه تست — کرم نما و فرود آ که خانه خانه تست

مجو درستی عهد از جهان سست نهاد — که ایں عجوزه عروس هزار داماد است

من از بیگانگاں هرگز نه نالم — که با من انچه کرد آں آشنا کرد

شاهد آن نیست که موئے و میانے دارد
بندهٔ طلعت آں باش که آنے دارد

کس ندانست که منزل گہ مقصود کجاست
ایں قدر ہست که بانگ جرسے می آید

واعظاں کیں جلوه بر محراب و منبر می کنند
چوں بخلوت میروند آں کار دیگر می کنند

صد ملک دل به نیم نگه میتواں خرید
خوباں دریں معامله تقصیر می کنند

فیض روح القدس ار باز مدد فرماید
دیگراں هم بکنند آنچه مسیحا می کرد

عیب مے جمله بگفتی هنرش نیز بگو
نفی حکمت مکن از بهر دل عامے چند

نخواهد ایں چمن از سرو و لاله خالی ماند
یکے همی رود و دیگرے همی آید

بسرّ خدا که عارف سالک بکس نگفت
در حیرتم که باده فروش از کجا شنید
حافظ وظیفهٔ تو دعا گفتن است و بس
در بند ایں مباش که نشنید یا شنید

آنانکه خاک را بنظر کیمیا کنند
آیا بود که گوشهٔ چشمے بما کنند

بریں رواق زبرجد نوشتہ اند بزر — کہ جز نکوئی اہل کرم نخواہد ماند

بخت حافظ گر ازیں گونہ مدد خواہد کرد — زلف معشوقہ بدست دگراں خواہد بود

جنگ ہفتاد و دو ملت ہمہ را عذر بنہ — چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

آسماں بار امانت نتوانست کشید — قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند

دست از طلب ندارم تا کام من برآید — یا تن رسد بجاناں یا جاں ز تن برآید

ما قصۂ سکندر و دارا نخواندہ ایم — از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

رموز مملکت خویش خسرواں دانند — گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش

نہ گویمت کہ ہمہ سال مے پرستی کن — سہ ماہ میخور و نہ ماہ پارسا می باش

درپس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند — انچہ استاد ازل گفت ہماں میگویم

ما زیاراں چشم یاری داشتیم — خود غلط بود انچہ ما پنداشتیم

اسپ تازی شدہ مجروح بزیر پالاں　　　طوق زرین ہمہ در گردن خرمی بینم

برو ایں دام بر مرغ دگر نہ　　　کہ عنقا را بلند است آشیانہ

بہ آب کوثر و زمزم سفید نتواں کرد　　　گلیم بخت کسے را کہ بافتند سیاہ

تکیہ بر جائے بزرگاں نتواں زد بگزاف　　　مگر اسباب بزرگی ہمہ آمادہ کنی

در رہ منزل لیلےٰ کہ خطرہاست بسے　　　شرط اول قدم آنست کہ مجنوں باشی

گر مسلمانی ہمینست کہ حافظ دارد　　　آہ اگر پس امروز بود فردائے

یہ اشعار جس موقع پر لکھنے یا بولنے میں آجاتے ہیں موتی کی طرح چمکتے ہیں اور کلام کا لطف ایک سے دس گنا ہو جاتا ہی۔

خواجہ کے سینکڑوں مضمون اردو شعرائے اردو زبان میں نقل کئے ہیں خاصکر غالب نے ہم اس موقع پر اس قسم کے چند اشعار بطور مثال کے لکھتے ہیں۔

خواجہ　منکہ ملول گشتمے از نفس فرشتگاں　　　قال و مقال عالمے میکشم از برائے تو

غالب　ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند　　　گستاخی فرشتہ ہماری جناب میں

خواجہ　بخدا کہ رشکم آید کہ نظر کنم بر ویش　　　کہ نظر دریغ باشد بچنیں لطیف روئے

غالب　دیکھئے قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے　　میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

خواجہ　جام جہاں نماست ضمیر منیر دوست　　اظہار احتیاج خود آنجا چہ حاجت است
غالب　جام جہاں نما ہے شہنشاہ کا ضمیر　　سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے

خواجہ　گر زمسجد بخرابات شدم عیب مگیر　　مجلس وعظ دراز است زماں خواہد شد
قائم　مجلس وعظ تو تا دیر رہے گی قائم　　یہ ہے میخانہ ابھی پی کے چلے آتے ہیں

خواجہ　بنال بلبل اگر با منت سر یاری ست　　کہ ما دو عاشق زاریم و کار ما زاری ست
رند　آعندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں　　تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل

خواجہ　نخواہد ایں چمن از سرو لالہ خالی ماند　　یکے ہمی رود و دیگرے ہمی آید
برق　ایک جاتا ہے تو آتا ہے عدم سے دوسرا　　اسکی محفل کا کبھی خالی مکاں ہوتا نہیں

خواجہ　درد یست درد عشق کہ ہیچش علاج نیست　　چندانکہ سعی بیش نمائی بتر شود
مومن　مریض عشق پر رحمت خدا کی　　مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

خواجہ　ارباب حاجتیم و زبان سوال نیست　　در حضرت کریم تمنا چہ حاجت است
کیسا کریم جو تجھے دینا ہو بے طلب دے　　فقیر ہوں پہ نہیں عادت سوال مجھے

خواجہ آئین تقوے مانیز دانیم | لیکن چہ چارہ با بخت گمراہ
غالب جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد | پر طبیعت ادھر نہیں آتی ہے

خواجہ میخواست گل کہ دم زند از رنگ و بوے دوست | از غیرت صبا نفسش در دہاں گرفت
سودا چمن میں گل نے جو کل دعویٰ جمال کیا | صبا نے مارتماچہ منہ اسکا لال کیا

خواجہ کے کلام کی نسبت رائیں

خواجہ کی زندگی ہی میں ان کا کلام بے نظیر تسلیم کر لیا گیا اور لوگ ان کو ملہم صوفی خیال کرنے لگے مولانا جامی جن کی ولادت خواجہ کی وفات کے پچیس ہی سال بعد ہوئی ہی۔ اور جو فارسی شاعری کے ایک رکن خیال کیے جاتے ہیں۔ ان کو لسان الغیب اور ترجمان الاسرار کا لقب دیتے ہیں کیونکہ ان کی زبان سے حقیقی عرفان کے راز اور صوفیانہ اسرار اس طرح صفائی اور بے ساختگی کے ساتھ نکلتے ہیں کہ گویا غیب سے القا ہو رہے ہیں۔

مولانا جامی کے علاوہ تمام شعراء فارس خواجہ کے کلام کی تعظیم کرتے ہیں اور اس کے مقابلہ کا خیال کرنا بھی بے ادبی سمجھتے ہیں۔ صائب فارسی غزل گوئی کا چوتھا رکن اور آخری اُستاد تسلیم کیا گیا ہی۔ اس نے خواجہ کی غزل پر غزل لکھی مقطع میں اس طرح عذر خواہی کرتا ہی۔

روا ست صائب اگر نیست اندرہ دعوے | تتبع غزل خواجہ گرچہ بے ادبی است

لے صائب اگر دعوے نہ ہو تو خواجہ کی غزل پر غزل لکھنی جائز ہے۔ اگرچہ یہ بھی بے ادبی ہے۔

سلیم طہرانی لکھتا ہے۔

سلیم معتقد نظم خواجہ حافظ باش — کہ نشہ بیش بود در شراب شیرازی

اے سلیم خواجہ حافظ کے اشعار کا معتقد رہ کیونکہ شیراز کی شراب میں نشہ زیادہ ہوتا ہے

مغرور شاعر عرفی جو تمام شعرا رفارس کو اپنے نزدیک ہیچ سمجھتا ہے چنانچہ قصیدہ گویوں کے بادشاہ حسان العجم خاقانی کے متعلق کہتا ہے ؎

زمانہ بیں کہ مرا جلوہ داد تا از رشک — بداغہائے پس از مرگ سوخت خاقانی

دیکھ جب سے زمانہ نے مجھکو شہرت دی رشک کے داغوں سے مرنیکے بعد بھی خاقانی جل اٹھا

ظہیر فاریابی کا مذاق اڑاتا ہے ؎

ازاں ز دست ہنرہائے خود ہمی نالم — کہ بر ظہیر ازیں شیوہ ہیچ در نکشاد

میں اس لیئے اپنے کمالات سے نالاں ہوں کہ ظہیر پر اس فن کا کوئی دروازہ نہیں کھل گیا

انوری جو کہ فارسی شاعری کے تینوں پیغمبروں میں سے ہے۔

در شعر سہ کس پیمبرانند — فردوسی و انوری و سعدی

اس کے متعلق کہتا ہے ؎

تفرجیکہ من از بہر روح ساز دہم — نہ انوری نہ فلانی دہد نہ بہمانی

جو خوشی کہ میں روح کے لیئے تیار کرتا ہوں وہ نہ انوری تیار کرسکتا ہے نہ کوئی اور دوسرا

ہندوستان غریب نے ایک شاعر اب تک پیدا کیا ہے۔ یعنی خسرو اس کو بھی اپنا زلہ خوار بنانا چاہتا ہے ؎

بروح خسرو ازیں فارسی شکر دادم — کہ کام طوطی ہندوستان شود شیریں

خسرو کی روح کو اس فارسی سے میں نے شکر دی کہ طوطی ہندوستان کا بھی منہ میٹھا ہو جائے۔

اور تو اور غزل گویوں کے پیر و مرشد شیخ سعدی جیسے بزرگ کو بھی تو اُس نے نہیں چھوڑا کہتا ہے ؎

نازش سعدی بمشت خاک شیراز از چہ بُو　　گر ندانستے کہ گردد مولد و ماوائے من

شیراز کی ایک مشت خاک پر سعدی کیوں ناز کرتا۔ اگر اس کو یہ نہ معلوم ہوتا کہ وہ میرا مقام اور وطن ہوگا

مگر خواجہ کے سامنے ادب سے گردن جھکا دیتا ہے اور سر تسلیم خم کر کے کہنے لگتا ہے۔

بگرد مرقد حافظ کہ کعبۂ سخن است　　در آمدیم بعزم طواف در پرواز

حافظ کے مزار کے ارد گرد جو کہ شاعری کا کعبہ ہے طواف کے ارادہ سے ہم نے اُڑنا شروع کیا۔

عرفی۔ نکتہ چیں عرفی۔ خود پسند عرفی کا خواجہ کے مرقد پاک کو کعبۂ سخن کہنا ایسے کئی دفتروں سے زیادہ ہے جو ان کی تعریف میں لکھے جائیں۔ ایک فارسی کا شاعر جس کا نام معلوم نہ ہو سکا کہتا ہے ؎

حافظ کہ لسان غیب آمد　　در گلشن جاں کسیب آمد

حافظ لسان الغیب ہے (انکا کلام) باغ جاں کے لئے بمنزلہ آب رواں کے ہے

ناکردن احترام شعرش　　در معرض عقل عیب آمد

اس کے اشعار کی عزت اور قدر نہ کرنا عقل کے نزدیک بُرا ہے

نہ صرف شعراء بلکہ ہر طبقہ اور ہر درجہ کے لوگوں نے ہر ملک اور ہر قوم کے سخن شناسوں نے خواجہ کے کلام کے حسن پر مدح و ثنا کے پھول نثار کئے اور تعریف و توصیف کے نغمے گائے ؎

نہ من بران گل عارض غزل سرایم و بس　　کہ عندلیب تو از ہر طرف ہزار انند

مولانا سودی فرماتے ہیں۔

حافظ کا کلام نہایت لطیف اور پاکیزہ ہے وہ آب حیات میں ہنایا ہوا ہے اور خوبصورتی میں بہشتی حور کے برابر ہے۔

کپتان کلارک مدح سرائی کرتا ہے۔

فردوسی کی فصیح و بلیغ رزمیہ اور سعدی کی پاکیزہ اخلاقی شاعری بے شک ایک اونچے درجہ کی مستحق ہے لیکن حافظ کا کلام ان سے بھی بہت زیادہ بلندی کا حقدار ہے۔

اس کے تمام کلام میں ایک جدت کی روح ہے۔ وہ سوائے ان خیالات کے جن کا صحیح فطرت اقتضا کرتی ہو اور کوئی خیال اپنی شاعری میں نہیں آنے دیتا وہ تصنع اور بناوٹ سے جس سے کلام کی خوبی میں نقص واقع ہو سخت نفرت کرتا ہے۔

دنیا کے کسی ملک میں کبھی کوئی ایسا عالی دماغ اور طبّاع شاعر نہیں پیدا ہوا۔

جدّت جو اہل کمال کا خاصہ ہے۔ اس کے اندر اس قدر ہے کہ لوگ اس کو ملہم خیال کرتے ہیں اس کے اشعار لطافت۔ سادگی۔ غیر مصنوعی شاعرانہ رنگینیوں اور زبردست جذبات سے لبریز ہیں۔ گرمی۔ متانت۔ اور زندہ دلی اس کے لفظ لفظ سے ٹپکتی ہے۔ وہ زمانہ کا انقلاب دنیا کی بے ثباتی ریاکاری کا فریب دکھاتا ہے۔ خالق کی عظمت۔ جوانی کی خوشی مذہب کی وسعت اور محبت کی خوبیاں بیان کرتا ہے۔ اس کے اشعار دلکش بے نظیر اور لاثانی اسلوب بیان رکھتے ہیں۔ اس کی غزلیں ذالت۔ پست ہمتی اور خود پسندی سے مبرا ہیں۔

ان کا طرز ادا بے انتہا انوکھا ہے۔ اور وہ مصنوعی ظرافتوں۔ مشکل بندشوں اور بعید از قیاس استعاروں سے پاک و صاف ہیں۔ ان میں رنج بھی ہے اور شوخی بھی تعریف بھی ہے اور شکایت بھی جس طرح وہ ولولہ انگیز ہیں اسی طرح پر حکمت ہیں اُن کا اسلوب بیان بے عیب دلنشیں اور نہایت بلیغ ہے کسی شعر سے ایک لفظ کا گھٹانا ایک حسن کا کم کر دینا ہے اس کا ہر ہر شعر جادو ہے۔ زبان صاف ستھری شیریں اور خوشگوار ہے۔

اس کے شعروں کی روانی اور سلاست پڑھنے والے کو خواہ وہ زاہد ہو یا رند مسرور کئے بغیر نہیں رہ سکتی نوجوان ان کو اپنے جوانی کے ایام عزم میں گزرنے کے لیئے سند سمجھتا ہے اور گوشہ نشین زاہد اُن کو عرفان کے اسرار کا مرقع خیال کر کے دعاؤں کی طرح پڑھتا ہے۔

چارلس اسٹورٹ لکھتا ہے۔

حافظ ایران کے تمام شاعروں میں فطرتی جذبات کا سب سے زیادہ راز داں ہے اس کا کلام صرف کلام الہٰی سے کم درجہ کا اور باقی سب سے بہتر خیال کیا جاتا ہے وہ سادہ اور لطیف ہے اور تصنع اور خود پسندی سے پاک ہے بعض بعض اشعار میں جو فخر و مباہات کی جھلک نظر آتی ہے۔

ان کو خود پسندی نہیں کہہ سکتے۔ ہر شخص جس کا مذاق صحیح ہے سمجھ سکتا ہے کہ یہ سخن گسترانہ شوخیاں اور شاعرانہ کلیلیں ہیں

مسٹر براؤن سعدی کے متعلق لکھتے ہوئے کہتے ہیں۔

سعدی کی غزلیں نہایت دلچسپ اور دلفریب ہیں اور سوائے اس کے ہم وطن

حافظ کی غزلوں سے اور کسی سے کم درجہ نہیں رکھتیں۔

بکنل تعریف کرتا ہے۔

حافظ زندہ دلی کے ساتھ عشق و محبت کے جذبات بیان کرتا ہے۔ اس کا فطرتی اور برجستہ کلام دل آویز تشبیہوں و استعاروں کے ساتھ دنیا کے علم ادب میں ایک نہایت ممتاز درجہ رکھتا ہے۔ اس کی خاص سلطنت میں کوئی اس کا ہمپایہ نہیں ہے۔ اس کے کلام میں گو بے انتہا آزادی اور خوشی ہے مگر کہیں الحاد کا رنگ نہیں پایا جاتا اس کی خوشی کے ساغر میں دہریت کی تلخی مطلق نہیں ہے۔ اس پر جس طرح ایشیا شیدا ہے اسی طرح یورپ بھی مفتون ہے۔

ڈاکٹر گاٹھیل لکھتے ہیں۔

حافظ کا دماغ روحانی سرزمین میں چکر لگاتا ہے۔ جب ہم اس کے کلام کا لطف اُٹھا رہے ہیں۔ اس وقت یہ بتانا بہت ہی مشکل ہے کہ آیا وہ مورتیں جن کی وہ تعریف کرتا ہے گوشت اور خون کی بنی ہوئی ہیں یا روحانی ہیں جن پر ایک پر اسرار پردہ پڑا ہوا ہے۔

مسٹر اوسلی کا قول ہے۔

حافظ کا کلام نہایت صاف اور سادہ شیریں اور ترنم ریز ہے وہ مخفی جذبات اور حقیقی اسرار سے لبریز ہے۔ مگر ان سب سے بڑھکر اس کا وہ بلند اسلوب بیان ہے جس کی برابری آج تک کسی سے نہ ہو سکی۔

الغرض خواجہ کا کلام ایک ہرا بھرا اور پھولا پھلا باغ ہے جو اس کی سیر کرتا ہے اس کے دل و

دماغ کو فرحت اور روح کو تازگی حاصل ہوتی ہے اور جو اس میں آتا ہے اس کی خوبیاں دیکھکر محو ہو جاتا ہے اور بے ساختہ اس کی زبان سے تعریف نکلتی ہے۔

غزل گفتی و در سفتی بیا و خوش بخواں حافظ　　که بر نظم تو افشاند فلک عقد ثریا را

ہم نے یورپین مصنفین کی رائیں صرف اس لیئے نقل کی ہیں کہ یہ معلوم ہو جائے کہ یورپ میں خواجہ کے متعلق ادیبوں کے کیا خیالات ہیں۔ اور وہ اُن کے کلام پر کسقدر فریفتہ ہیں۔ ورنہ خواجہ کے کلام کی مقبولیت اور وقعت ان سب تعریفوں سے بلند تر ہے اور ایشیا والوں کے لیئے ان کے کلام کی عظمت اور ان کی شاعری کا کمال ثابت کرنے کے واسطے ان رایوں کی ضرورت نہیں ہے

گوہر پاک تو از مدح و ثنا مستغنی است　　فکر مشاطہ چہ با حسن خدا داد کند

چند روز ہوئے ہماری ملاقات ایک یورپین عالم سے ہوئی اثنائے گفتگو میں حافظ کا تذکرہ آیا۔ اس نے کہا کہ حافظ تو بہت بڑا شاعر ہے۔ اور یورپ میں اس کی بڑی قدر کی جاتی ہے۔ ہماری زبان میں متعدد ترجمے اس کے دیوان کے ہوئے ہیں اور ان کو اکثر لوگ پڑھتے ہیں۔ میرا یہ خیال ہے کہ ایشیا کے لوگ اس کی اتنی قدر نہیں کرتے۔

ہم نے کہا یہ ٹھیک ہے کہ یورپ کو اب حافظ کے ساتھ ذوق ہو چلا ہے اور وہاں کے لوگ اس کی قدر کرنے لگے ہیں۔ اور حافظ کے کلام میں ایسی خوبیاں اور دلچسپیاں موجود ہیں کہ تمام دنیا اس کی قدر کرے گی مگر آپ کا یہ فرمانا کہ ایشیا کے لوگ اس کی اتنی قدر نہیں کرتے غلط ہے۔ قدر کیا ایشیا میں تو اس کے کلام کی پرستش ہوتی ہے

اے گل تو دوش داغ صبوحی کشیدہ　　ما آں شقائقیم کہ با داغ زادہ ایم

اصلیت یہ ہے کہ خواجہ کے کلام کا حسن ایشیا والوں کے لیے بے نقاب ہے وہ دیکھ

اس کا جلوہ دیکھتے ہیں مست ہوتے ہیں۔ وجد کرتے ہیں۔ بخلاف اہل یورپ کے کہ مذاق اور زبان کے اختلاف کا پردہ بیچ میں حائل ہے اور وہ ترجمہ کی عینک سے اس کا نظارہ کرتے ہیں جس سے ایک دھندلی سی تصویر اس کے حسن کی ان کو نظر آتی ہے۔ مگر باوجود اس کے ان کی ہمت پر آفریں ہے کہ وہ علم پرستی کے ذوق میں سرگرمی سے اس کا مطالعہ کرتے ہیں ؎

ہمت مرغ سحر خواں کا ہوں قائل کہ اُسے ۔۔۔ نالہ سے زمزمہ مقصود ہے تاثیر نہیں

خواجہ کے کلام کا اثر

ارسطو نے شاعری کو بھی منطقی دلائل کی فہرست میں درج کیا ہے۔ یعنی جس طرح مختلف قسم کی دلیلوں سے نتیجے ثابت ہوتے ہیں اور ان میں یہ قدرت ہوتی ہے کہ انسان کو کسی بات کے تسلیم کرنے پر مجبور کریں اسی طرح شاعری میں بھی یہ طاقت ہے۔

شاعری شراب سے بہت زیادہ مشابہت رکھتی ہے۔ شراب انسان کے دماغ پر اپنا اثر ڈالکر اس کو مدہوش بنا دیتی ہے۔ اسی طرح شاعری بھی اپنا اثر ڈال کر بیخود کر دیتی ہے۔

ہر قوم کی شاعری کا ایک اندرونی اثر جس کا ظاہر میں احساس نہیں ہوتا۔ آہستہ آہستہ اس پر ہوتا رہتا ہے اور جس قوم کی شاعری میں جیسے خیالات ہوتے ہیں اس قوم کے اخلاق و عادات میں ویسی ہی ان کی جھلک نمایاں ہوتی ہے۔

عربوں کی شاعری۔ بہادری۔ فیاضی۔ خودداری اور مہمان نوازی وغیرہ کے خیالات سے لبریز ہے۔ چنانچہ یہ اوصاف بھی ان میں نمایاں طور پر پائے جاتے ہیں۔

چونکہ فارسی شاعری میں زیادہ تر حسن پرستی کے خیالات ہوتے ہیں اس وجہ سے لوگوں کا یہ خیال ہے کہ اس کا اثر انسان کے اخلاق پر اچھا نہیں پڑتا خاصکر نوجوانوں کے حق میں یہ نہایت ہی مضر ہے۔ اور خواجہ کا دیوان چونکہ بادۂ شاعری کی روح ہے۔ اسلئے وہ اور بھی زیادہ جلد پڑھنے والے کو مست اور متوالا بنا دیتا ہے اور نوجوانوں کا دل و دماغ اس کے برداشت کی مطلق طاقت نہیں رکھتا۔

چنانچہ یہ مشہور ہے کہ شہنشاہ عالمگیر نے ممانعت کر دی تھی کہ کوئی اس کو نہ پڑھے کیونکہ عوام الناس صرف اس کے ظاہری معنی سمجھکر گمراہ ہوتے ہیں اور اس کے حقیقی مقصد اور صوفیانہ اسرار کی تہ تک نہیں پہنچ سکتے۔

مگر اس کے ساتھ ہی جہاں پناہ ایک نسخہ دیوان کا ہر وقت اپنے سرہانے رکھتے تھے ہمارے ایک ستم ظریف دوست کا مقولہ ہے کہ فارس کو دستوری نہیں جمہوری سلطنت بھی ملجائے لیکن جب تک وہاں دیوان حافظ اور شراب موجود ہے اس وقت تک وہ کبھی ترقی نہیں کر سکتا۔ بھلا جس ملک میں اس قسم کے شعروں کا

حدیث از مطرب و مے گو و راز دہر کمتر جو ... کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت این معمارا

رموز مملکت خویش خسروان دانند ... گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش

دن رات چرچا ہو وہاں کے لوگوں میں ذمہ داری برداشت کرنے کی قابلیت کیونکر پیدا ہو سکتی ہے

مولانا حالی حیات سعدی میں لکھتے ہیں

خواجہ حافظ کی غزل مجالس اور محافل میں سب سے زیادہ گائی جاتی ہے

اور اُس کے مضامین سے اکثر لوگ واقف ہیں۔ وہ ہمیشہ سامعین کو چند باتوں
کی ترغیب دیتی ہے۔ عشق حقیقی کے ساتھ عشق مجازی اور صورت پرستی وکام
جوئی کو بھی وہ دین و دنیا کی نعمتوں اور فضیلتوں سے افضل بتاتی ہے۔ مال و
دولت علم و ہنر نماز روزہ۔ حج زکوٰۃ۔ زہد۔ تقویٰ۔ غرضکہ کسی شے کو نظربازی
اور شاہد پرستی کے برابر نہیں ٹھیراتی وہ عقل و تدبیر۔ مآل اندیشی تمکین و وقار
ننگ و ناموس جاہ و منصب وغیرہ کی ہمیشہ مذمت کرتی ہے اور آزادگی۔ رسوائی
بدمستی۔ بے سروسامانی وغیرہ کو جو کہ عشق کی بدولت حاصل ہو تمام حالتوں
سے بہتر ظاہر کرتی ہے۔ دولت دنیا پر لات مارنا عقل و تدبیر سے کبھی کام
نہ لینا توکل و قناعت کے نشہ میں اپنی ہستی مٹا دینا۔ اور جوہر انسانیت
کو خاک میں ملا دینا۔ دنیا ومافیہا کے زوال و فنا کا ہر وقت تصور باندھے
رکھنا۔ علم و حکمت کو لغو و لوچ اور حجاب اکبر جاننا حقائق اشیا میں کبھی غور و
فکر نہ کرنا کفایت شعاری اور انتظام کا ہمیشہ دشمن رہنا۔ جو کچھ ہاتھ لگے
اس کو فوراً رائیگاں کھو دینا اور اسی طرح کی اور بہت سی باتیں اس سے
مستفاد ہوتی ہیں ظاہر ہے کہ یہ تمام مضامین ایسے ہیں جو ہمیشہ بے فکروں
اور نوجوانوں کو بالطبع مرغوب ہوتے ہیں اور کلام کا سادہ اور عام فہم
ہونا اور شاعر کی فصاحت و بلاغت اور مطرب و رقاصہ کی خوش آوازی
اور حسن و جمال اور مزامیر کے سلیے ان کو لے اُڑتی ہے اور ان کی تاثیر
کو دس بیس گنا کر دیتی ہے اور جب باوجود ان سب باتوں کے سامعین
کو یہ اعتقاد بھی ہو کہ اس کلام کے قائل اکابر صوفیہ اور مشائخ کرام ہیں

جن کی تمام عمر حقائق اور معارف کے بیان کرنے میں گذری ہو اور جن کا شعر شریعت کا لب لباب اور طریقت کا رہنما اور عالم لاہوت کی آواز ہو تو یہ مضامین اور بھی دلنشیں زیادہ ہو جاتے ہیں۔

یہاں تک نقل کرنے کے بعد یکایک دیدۂ خیال کے سامنے خواجہ کی نورانی شکل آگئی جو مجھ سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں ؎

عیب مے جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو　　نفی حکمت مکن از بہر دل عامے چند

میں نے سوچا کہ شاعری کو عمل کرنے کے لیئے کوئی نہیں پڑھتا بلکہ جذبات کی تیغ کو سان پر رکھنے کے لیئے اس کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ شاعری روحانی لطیف جذبات کی غذا ہے۔ جس طرح سُریلی آواز سے روح کو سرور ہوتا ہے۔ اسی طرح اچھے اشعار سے اس کو بالیدگی ہوتی ہے۔ بعض وقت صرف ایک شعر سے روح کو ایسا لطف حاصل ہے جو بدون اس کے ممکن ہی نہ تھا۔ اور خواجہ کی شاعری کی اصلی بنیاد صرف ایک جذبہ پر ہے یعنی محبت پر۔ وہ محبت جو دنیا میں سب سے زیادہ قیمتی چیز ہے۔ وہ جس سے انسان مجسم نور بنجاتا ہے۔ جس سے اس کی پرستش ہونے لگتی ہے۔

اسی محبت کو وہ شراب سے تعبیر کرتے ہیں اور اسی کی تعریف سے ان کا تمام دیوان لبریز ہے۔ ان کا تمام کلام حقیقت و عرفان کا نچوڑا اور سلوک و تصوف کی جان ہے اس میں ہزارہا بیش قیمت اسرار ہیں۔ خاصکر اہل دل کے لیئے تو وہ روحانی شراب ہے وہ اس پر جان و دل سے فریفتہ ہیں اور نہ صرف مسلمان بلکہ غیر قوم کے لوگ بھی مہرشی دیوندرا ناتھ ٹھاکر جی اپنے معتقدوں کو تاکید کیا کرتے تھے کہ وہ دیوان کو مطالعہ میں رکھیں اور خود وہ جس زمانہ میں کوہ ہمالیہ میں تپشیا اور ریاضت میں مصروف

تھے تو یہی دیوان ان کا انیس و ہمدم تھا۔

ایسا نفیس کلام جس سے ہر مذہب و ملت کے برگزیدہ لوگ روحانی سرور حاصل کریں۔ اکابر مشائخ اور صوفیہ کرام اس کو آب حیات سمجھیں۔ شاعر اور ادیب اس پر جان دیں۔ اگر سادہ لوحوں پر اس سے اچھا اثر نہ پڑے تو کیا اس کلام کی وقعت میں کچھ بھی فرق آسکتا ہے؟

کیا یوسف کے حسن کی قدر اس سے کچھ بھی کم ہو سکتی ہے کہ اس نے زلیخا کو رسوا کیا

اصلیت یہ ہے کہ غزلیں عام طور پر محض بو الہوسی اور عشق مجازی کے جذبہ کو برانگیختہ کرتی تھیں لیکن سعدی اور حافظ وغیرہ نے ان میں عشق حقیقی کی بھی روح پھونکی۔ اور اپنی وجدانی کیفیات اور غیبی واردات کو گل و بلبل اور مے و ساقی کے افسانے میں ادا کیا تاکہ عوام کو بھی اس سے دلچسپی رہے۔ اور ان کے جذبات پاکیزہ ہوں۔ کیونکہ کنایہ ہمیشہ تصریح سے زیادہ موثر ہوتا ہے ؎

خوشتر آں باشد کہ سر دلبراں گفتہ آید در حدیث دیگراں

انھوں نے غزل کو جہاں وہ ہوس پرستی کا ذریعہ تھی۔ روحانی پاکیزگی کا وسیلہ بنا دیا اور بادہ انگور کو شراب طہور کر دیا۔

مولانا حالی نے بھی اس بات کو تسلیم کیا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی وہ حافظ کی غزلوں کو قوم کے لئے خطرناک خیال کرتے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں

خواجہ حافظ کی غزل کی حمارست اور مزاولت سے بیشک ابرار و احرار کے دلوں میں دنیا کی بے ثباتی اور توکل و استغنا و قناعت کا نہایت پختہ خیال پیدا ہوتا ہے۔ اور اوباش و الواط کو بے فکری۔ ناعاقبت اندیشی

عشقبازی ۔ بدنامی و رسوائی کی ترغیب ہوتی ہے اور قوم کی موجودہ حالت کے لحاظ سے پہلی تاثیر بھی ویسی ہی خانہ برانداز اور خانماں سوز ہے جیسی دوسری۔

مگر ہم پوچھتے ہیں کہ کیا شاعرانہ جذبات کے مار ڈالنے سے قومیت زندہ ہوتی ہے کیا قومی زندگی صرف ایک خشک زندگی کا نام ہے۔ ہم نے خود خواجہ سے سوال کیا کہ فرمائیے قوم کا مبصر آپ کی شاعری کو قومیت کے لیئے سم قاتل بتاتا ہے آپ کیا کہتے ہیں؟ خواجہ نے جواب دیا ؎

گویند رمز عشق مگوئید و مشنوید　　مشکل حکایتیست کہ تقریر مے کنند

حقیقت یہ ہے کہ شاعرانہ جذبات قومیت کے لیئے زیور ہیں۔ قومیت خود ایک شاعرانہ جذبہ کا نام ہے۔

ہم نے مانا کہ قوم کے پیٹ کو اس وقت علوم و فنون سے بھرنے کی ضرورت ہے اور شاعری یا موسیقی وغیرہ جو دماغی آسائش کی چیزیں ہیں آسودہ حالی اور فارغ البالی ہیں اچھی معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن کیا موتی محض اس لیئے کہ کھائے نہیں جاتے پائمال کر دیئے جائیں۔ نہیں ان کی قدر کرو کیونکہ حسینوں کے گلے کی زینت ہیں۔ وہ شاہانہ تاجوں میں چمکتے ہیں۔

فالیں

سرخی لکھنے کو تو لکھدی مگر شبدیز قلم ابھی اس میدان میں قدم بھی نہ رکھنے پایا تھا کہ دل نے زور سے اس کی لگام کھینچلی اور کہا کہ ہیں!! فالیں! مسلمان

کہیں فالوں پر بھی اعتقاد رکھتے ہیں۔

میں ہزاروں آدمی دیوان حافظ میں فالیں دیکھتے ہیں۔ ان کو ماننے میں پھر حافظ کا سوانح نگار اس مقبول عام اور دلچسپ عنوان کو کیونکر چھوڑ سکتا ہے۔

دل کوئی عقیدہ رکھا کرے تمہیں اس سے۔ کیا تم جانتے نہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پہلے شخص ہیں جنہوں نے نجومیوں کو جھٹلایا اور فرمایا کذب المنجمون ورب الکعبۃ (خدا کی قسم نجومی جھوٹے ہوتے ہیں) بھلا سوچو تو سہی کہ غیب کی بات بھی کوئی بتا سکتا ہے قرآن شریف میں ہے۔ وعندہ مفاتح الغیب لا یعلمہا الا ھو۔ (اللہ ہی کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں اس کے سوا ان کو کوئی نہیں جانتا) مسلمانوں کو ممانعت کی گئی ہے کہ وہ فال اور شگون نہ لیا کریں تمہیں معلوم نہیں کہ پیغمبر صاحب نے سچے مسلمانوں کی ایک علامت یہ بھی بتائی ہے کہ وھم لا یتطیرون (وہ شگون نہیں لیتے۔)

میں مگر میں تو ادبی دلچسپی کے خیال سے لکھنا چاہتا ہوں مجھ سے پہلے کئی مصنفوں نے اسی عنوان پر کتابیں لکھی ہیں میں ہی اس بدعت کی بنیاد نہیں ڈالتا۔

دل غلطی کتنے ہی آدمیوں سے ہو پھر بھی وہ غلطی ہے۔ رہی ادبی دلچسپی۔ سو جو لوگ کچے عقیدے کے ہیں وہ اس کا کب خیال کریں گے۔ تمہاری تو ادبی دلچسپی ہو گی اور وہاں عقیدے بگڑ جائیں گے۔

کسی کی جان گئی آپ کی ادا ٹھہری

میں مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ عوام کے خیال سے خواص کو بھی جو عقل و فہم رکھتے ہیں اس لطف سے محروم رکھوں مجھے کسی کے عقیدہ سے کیا واسطہ اپنے کام سے کام ہے

تاریخ نویسی کے قانون کے مطابق اس موقع پر مجھ پر فرض ہے کہ اس عنوان پر کچھ ضرور لکھوں۔

دل لوگوں کے عقیدے کو خراب کرنا قطعاً ناجائز ہے اور سراسر خلاف شرع ہے۔

میں اچھا لاؤ خود دیوان حافظ میں دیکھیں خواجہ بھی اس کو خلاف شرع بتاتے ہیں یا نہیں۔

دل ہیں! خلاف شرع بات پر اصرار کرنا سخت گناہ ہے

میں خیر دیکھنے میں کیا حرج ہے دیوان کھولتے ہی یہ شعر نظر پڑا۔

بیا تا در صف رندان بہانگ چنگ مے نوشیم — کہ ساز شرع زیں افسانہ بیقانون نخواہد شد

آؤ ہم رندوں کے جھگڑے میں چنگ بجا کر شراب پئیں۔ کیونکہ شریعت کا باجا ان باتوں سے بے سُرا نہیں ہو گا

دل یہ بھی اتفاق کی بات ہے۔ اس کی پیروی کرنی ہرگز مناسب نہیں ہے قرآن میں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔ الشعراء یتبعھم الغاوٗن (شاعروں کی پیروی ہی لوگ کرتے ہیں جو گمراہ ہوتے ہیں)

میں اب تو لفنتوں لے حافظ میں ضرور لکھونگا۔

دل نہیں نہیں ہرگز نہیں کیا فائدہ محنت بھی کرو اور گنہگار بھی بنو۔

میں ہر کام کی سزا و جزا نیت کے مطابق ہوتی ہے۔

دل یہ مانا۔ لیکن قصداً ایسا کوئی کام کرنا جس سے خلقت خدا توہم پرستی میں مبتلا ہو جائے بہت بڑا گناہ ہے اور ایسا شخص شیطان ہے

میں اچھا آپ جبریل بنے بیٹھے رہیے اور مجھے لکھنے دیجئے۔ ع

چل رے خامہ بسم اللہ

اسلام سے پیشتر دنیا کی تمام قوموں میں فال اور شگون لینے کا رواج تھا۔ اہل روم بھی جو اس زمانہ میں تمدن اور شائستگی میں بلند ترین درجہ رکھتے تھے اس میں مبتلا تھے۔ اور وہ بھی جاہل عربوں کی طرح چڑیوں کے اڑنے سے اور ان کی آواز سے شگون لیتے تھے بہت سے لوگ اس غرض کے لیے نجومیوں اور کاہنوں کے پاس جاتے تھے۔

عام عیسائی قوموں میں کتاب مقدس سے بھی فال نکالنے کا رواج تھا اور چونکہ ہومر کی ایلیڈ اور اوڈیسی دونوں کتابیں بھی ان میں بیحد مقبول تھیں وہ لوگ ان سے بھی فالیں نکالا کرتے تھے ان کی خوش اعتقادی یہانتک بڑھ گئی تھی کہ بڑے بڑے حاذق طبیب لاعلاج مریضوں کے سرہانے ہر رات کو ایک ایک حصہ ایلیڈ کا رکھواتے تھے اور اس کی برکت سے شفا کی امید رکھتے تھے۔

اسلام کے نور نے جہاں تمام توہم پرستی کی ظلمتوں کو مٹا دیا وہاں فال اور شگون کے مشغلہ کو بھی بے حقیقت کر دیا۔ مگر انسان میں جہاں بہت سی کمزوریاں ہیں وہاں ایک یہ بھی کمزوری اس کے اندر ہے کہ وہ اپنے آئندہ حالات کے جاننے کا بڑا شائق ہوتا ہے خاصکر جب وہ کوئی ارادہ یا کام کرتا ہے تو اس کے انجام اور نتیجہ کے دریافت کرنے کا ہر وقت اس کو خیال رہتا ہے۔ اور گو وہ کیسا ہی پختہ عقیدہ کا ہو اور اس بات پر کامل یقین رکھتا ہو کہ غیب کا علم کسی مخلوق کو ہو نہیں سکتا مگر جب اپنے متعلق کسی پیشین گوئی کو سنتا ہے تو ضرور دلچسپی لیتا ہے۔ چنانچہ ابھی اسلام کو دو صدیاں بھی نہ گزرنے پائی تھیں کہ خلیفہ منصور عباسی کے دربار میں ہندوستان کے جوتشی پہنچے اور ان کی وجہ سے عربوں کو پھر فال شگون اور اچھی بری ساعت دیکھنے کا چسکا پڑ گیا۔ اور رفتہ رفتہ یہ بیماری تمام اسلامی ممالک میں پھیل گئی۔

خاصکر فارس میں استخارہ فال اور شگون وغیرہ کا بہت ہی زیادہ رواج تھا سعدی اور حافظ کے کلام میں جابجا اس کا ذکر ہی۔ بعض بعض شعروں سے معلوم ہوتا ہی کہ خواجہ حافظ خود بھی فال نکالا کرتے تھے مثلاً۔

از غم و درد مکن نالہ و فریاد کہ دوش زدہ ام فالے و فریاد رسے مے آید

روز ہجران و شب فرقت یار آخر شد زدم این فال و گذشت اختر و کار آخر شد

بہت سے لوگ قرآن سے فال نکالتے تھے۔ بعضوں نے یہ سوچکر کہ قرآن کا درجہ اس سے بلند ہی اور اس سے فالیں نکالنی بے ادبی ہی مولانا روم کی مثنوی اور شیخ سعدی کی بوستان کو اس کام کے لیئے منتخب کیا۔ مگر دیوان حافظ سب سے زیادہ موزون خیال کیا گیا۔

اس کی وجہ یہ ہی کہ خواجہ کی شاعری کو انسان کے عام معاملات سے بہت زیادہ تعلق ہی۔ کیونکہ اُنھوں نے روزمرہ کے واقعات مشاہدات اور پیش نظر چیزوں سے شاعرانہ خیالات اخذ کیئے ہیں۔ اس لیے جو سوالات انسانی معاملات کے متعلق کیئے جاتے ہیں اُن کے جواب میں اکثر مناسب اشعار نکل آتے ہیں۔

علاوہ بریں چونکہ ان کے اشعار عشق حقیقی اور عشق مجازی دونوں کا پہلو رکھتے ہیں اس لیئے ان کے معانی میں بہت بڑی وسعت ہوتی ہی۔ اور طرح طرح کی تاویلوں کی گنجایش نکل سکتی ہی۔ اور فال دیکھنے والا ہیر پھیر کر اپنی منشا کے مطابق اس میں معنی پہنا سکتا ہی۔

ایک بات یہ بھی ہی کہ خواجہ کے اشعار بے نظیر ہیں اور جب کسی سوال کے جواب میں ان کا کوئی شعر نکلتا ہی تو اپنے انوکھے طرز بیاں سے دل میں کھب جاتا ہی اور فال

کی دلچسپی کو بڑھاتا ہے۔

اس کے ساتھ ہی خواجہ چونکہ بہت بڑے صوفی اور ولی اللہ تھے اور ان کے کلام پر صوفیانہ تقدس کا غلاف چڑھا ہوا ہے اس لیئے عوام الناس ان کے روحانی تصرف کا بھی اعتقاد رکھتے ہیں۔ چنانچہ خواجہ کا معتقد خاص پنڈت خوشگو کہتا ہے کہ

میں نے سوچا کہ کیا وجہ ہے کہ خواجہ سے جس بات کا سوال کیا جاتا ہے اسکا جواب نہایت ٹھیک دیتے ہیں۔ اسکے لیئے بھی میں نے دیوان میں دیکھا محکو یہ شعر ملا ؎

معجز است این شعر یا سحر حلال　　ہاتف آرد این سخن یا جبرئیل

میں سمجھ گیا کہ بے شک خواجہ کی شاعری میں کوئی غیبی آواز شامل ہے۔

الغرض ان تمام وجوہات سے دیوان حافظ میں پوری قابلیت اس بات کی موجود تھی کہ لوگ اس سے تفاؤل کریں نظیری نیشاپوری کہتا ہے۔

حسب حال خود کس از مجموعۂ بارے نخواند　　حافظ شیراز را دیوان فرخ فال کو

چنانچہ لوگوں نے کثرت کے ساتھ اس سے تفاؤل کرنا شروع کیا۔ اور بہت سے لوگوں نے ان فالوں کو کتاب کی شکل میں جمع کیا۔ حاجی خلیفہ کشف الظنون میں لکھتا ہے کہ محمد بن شیخ محمد ہروی نے ایک رسالہ لکھا ہے جس میں خواجہ حافظ کے لسان الغیب ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ اور ان کے دیوان کی بہت سی فالیں جو مناسب موقع کے واقع ہوئی ہیں۔ اس میں جمع کی ہیں" پھر آگے لکھتا ہے" مولانا حسین کفوی متوفی ۱۰۱۰ھ نے بھی اسی قسم کی ایک کتاب ترکی زبان میں لکھی ہے"

اس کی ابتدا یوں بیان کی جاتی ہے۔ کہ جب خواجہ کا انتقال ہوا تو بعض علما نے ان کے جنازہ کی نماز پڑھنے سے انکار کیا۔ شاہ منصور بھی جنازے میں شریک تھا اس نے

سبب دریافت کیا۔ ان لوگوں نے جواب دیا کہ حافظ کا کلام ملحدانہ ہو اس لئے ان کے جنازے کی نماز جائز نہیں۔ بادشاہ نے کہا کہ کیا ثبوت ہو؟ انھوں نے کہا کہ کلام منگایا جائے تو ہم الحاد ثابت کرسکتے ہیں۔ اسی وقت ان کی غزلوں کے مسودے منگائے گئے۔ پہلا ہی ورق جو اُٹھایا تو اس میں یہ شعر نکلا۔

قدم دریغ مدار از جنازۂ حافظ　　　که گرچه غرق گناہست میرود بہشت

حافظ کے جنازہ سے قدم نہ روکیے کیونکہ وہ اگرچہ گناہ میں غرق ہو لیکن بہشت میں جارہا ہے

اس تائید غیبی کو دیکھکر سب خاموش ہوگئے اور بلا چون وچرا جنازہ کی نماز ادا کی۔ اسی دن سے خواجہ کا نام لسان الغیب رکھا گیا اور لوگ اُن کے دیوان سے تفاؤل کرنے لگے۔

لیکن جہاں تک ہم کو معلوم ہوسکا خواجہ کو لسان الغیب اور ترجمان الاسرار کا خطاب سب سے پہلے مولانا جامی نے اپنی کتاب نفحات الانس میں جو ۸۶۵ھ میں لکھی گئی ہو دیا ہو مگر اس لیے نہیں کہ وہ غیب کی باتیں بتاتے ہیں۔ کیونکہ مولانا جامی نے خود ہی اپنی دوسری کتاب بہارستان میں جو ۸۹۲ھ میں اُنھوں نے لکھی ہو لسان الغیب کے لقب کی اس طرح تشریح کی ہو کہ حافظ کے اشعار بلا تکلف اس صفائی کے ساتھ ان کی زبان سے نکلتے ہیں کہ گویا عالم غیب سے القا ہورہے ہیں۔

مگر مولانا آزاد بلگرامی کی جو تفاؤل کے معاملہ میں نہایت خوش اعتقاد ہیں اس معنی سے تسلی نہیں ہوتی وہ کہتے ہیں کہ خواجہ کے لسان الغیب کہنے کی یہ بھی وجہ ہو کہ وہ غیب کی باتیں بتادیتے ہیں چنانچہ وہ خواجہ کی تعریف میں کہتے ہیں۔

مرداں ز خاک ہم خبر آسماں دہند | فال کلام حافظ شیراز کن لحاظ

ہندوستان کے بادشاہوں میں ہمایوں اور جہانگیر فالوں کے بڑے معتقد تھے اور زیادہ تر دیوان حافظ سے تفاؤل کیا کرتے تھے ایک نسخہ دیوان حافظ کا جو ہمایوں اور جہانگیر کے پاس بھی رہا ہے اب بانکی پور کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ ان دونوں شہنشاہوں نے اپنی کئی فالیں اور یادداشت جو انھوں نے دیوان سے نکالی تھیں مع سنہ و تاریخ کے اس کے حاشیہ پر اپنے قلم سے لکھی ہیں۔ ہم مولوی عبدالمقتدر صاحب کے خاص طور پر شکر گزار ہیں جنھوں نے نہایت جستجو اور تحقیق کے ساتھ تواریخ سے مطابقت وغیرہ کی تفصیل دریافت کی اور خوش اسلوبی کے ساتھ ان کو لکھا۔

ہمایوں نے شیر شاہ کے مقابلہ میں اپنے خود غرض بھائیوں مرزا کامران اور مرزا عسکری کو اپنے ہمراہ متحد کرنے کے لئے بڑی کوشش کی لیکن وہ یوسف کے بھائی نکلے اُنھوں نے اس کی بات نہ مانی اور اس سے الگ رہے آخر شیر شاہ نے ۹۴۷ھ میں ہمایوں کو شکست فاش دی اور وہ مجبوراً ہندوستان سے بھاگ کر فارس میں طہماسپ کے یہاں پناہ گزیں ہوا۔

۹۶۱ھ میں جب وہاں سے فوج لیکر پھر ہندوستان پر چڑھائی کا ارادہ کیا اسوقت دیوان حافظ میں فال دیکھی یہ شعر نکلا۔

عزیز مصر برغم برادران غیور | ز قعر چاہ برآمد بہ اوج ماہ رسید

عزیز مصر اپنے بھائیوں کی منشا کے خلاف کنوئیں کی پستی سے نکل کر چاند کی بلندی پر پہنچا

پہلی لڑائی قندہار میں ہوئی جس میں مرزا عسکری گرفتار ہوا دوسری کابل میں جس میں کامران نے شکست کھائی پھر ہندوستان کی طرف بڑھا اس وقت بھی فال دیکھی یہ

جواب ۱۱۔

دولت از مرغ ہمایوں طلب و سایۂ او　　زانکہ باز اغ و زغن شہپر دولت نبود

مرغ ہمایوں (ہما) کے سایہ میں دولت حاصل کرو چیل اور کوّے کے پاس دولت کے پر نہیں ہوتے

آخر دو ایک مقابلہ کے بعد ۹۶۲ھ میں دہلی کے تخت پر آ کر بیٹھ گیا۔

تھوڑے عرصہ کے بعد عادلی نے صوبہ بہار سے لیکر جونپور تک اپنا قبضہ جما لیا اور خود مختاری کا علم بلند کیا سلطان محمد خاں صوبہ دار بنگالہ نے اس پر فوج کشی کی مگر عادلی نے ہیموں کی مدد سے اس کو شکست دیدی ہمایوں نے یہ کیفیت دیکھکر خود اس کی گوشمالی کا ارادہ کیا۔ اس وقت دیوان حافظ میں بھی فال دیکھی کہ نتیجہ کیا ہو گا۔ یہ شعر نکلا۔

نظر بر قرعۂ توفیق و یمن دولت شاہست　　بدہ کام دل حافظ کہ فال بختیاران بو

بادشاہ کے دولت کے عروج اور توفیق الہی کی فال نکلتی ہے حافظ کے دل کا مقصد پورا کر کیونکہ اس نے خوش قسمتی کی فال نکالی

ہمایوں نے اس فال پر جو یادداشت لکھی ہے اس میں لکھا ہے کہ "انشاء اللہ چوں فتح ولایات شرقی و مبارزان آں دیار بامر کردگار شود نذر خوبے بخواجہ لسان الغیب فرستادہ شود" اس سے اس کی کمال عقیدت کا پتہ ملتا ہے۔

جہانگیر بھی اس سے کم معتقد نہ تھا۔ وہ لکھتا ہے "در بسیارے از مطالب بدیوان خواجہ رجوع نمودہ ام و بحسب اتفاق انچہ برآمدہ نتیجہ مطابق ہماں بخشیدہ و کم است کہ تخلف نمودہ"

جہانگیر نے شہنشاہ اکبر کی آخری عمر میں بلنوشی بہت زیادہ کر دی تھی اس وجہ سے اکبر اس سے رنجیدہ رہتا تھا اس کے ساتھ ہی اس نے ابوالفضل جیسے لایق وزیر کو قتل کرا دیا۔ اس سے اس کے غصہ کی آگ اور بھڑک گئی۔ جہانگیر انہیں وجوہات سے الہ آباد میں رہتا تھا۔

سنہ ۱۰۱۴ھ میں اکبر زیادہ بیمار ہوا دربار کے بڑے بڑے امرا راجہ مان سنگھ و خان اعظم وغیرہ اس جوڑ توڑ میں لگے کہ خسرو ولی عہد ہو اور جہانگیر نہو۔ اکبر کے کان جہانگیر کی طرف سے بھرنے شروع کئے۔ جہانگیر کو بھی ان باتوں کی خبریں پہنچتی رہتی تھیں وہ بہت پریشان تھا کہ کیا کرے اگر جائے تو جان کا خوف اور نہ جائے تو خسرو کامیاب ہوجائے۔ آخر اس نے دیوان میں فال دیکھی مندرجہ ذیل غزل نکلی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا حافظ نے یہ غزل صرف اسی موقع کے لئے لکھی تھی۔

چرا نہ در پئے عزم دیار خود باشم — چرا نہ خاک کف پائے یار خود باشم

غم غریبی و غربت چو برنمے تابم — بشہر خود روم و شہریار خود باشم

ز محرمانِ سراپردۂ وصال شوم — ز بندگانِ خداوندگار خود باشم

ہمیشہ پیشۂ من عاشقی و رندی بود — کنوں بکوشم و مشغول کار خود باشم

چو کار عمر نہ پیدا است بارے آں اولے — کہ روز واقعہ پیش نگار خود باشم

بود کہ لطف ازل رہنموں شود حافظ
وگرنہ تا با بد شرمسار خود باشم

یہ فال دیکھتے ہی کشتی میں سوار ہو کر سیدھا آگرہ پہنچا مان سنگھ نے شاہی محل کا دروازہ بند کر لیا تاکہ اس کو اکبر تک نہ پہنچنے دے لیکن کسی ذریعہ سے اس کو جہانگیر کے آنے کی خبر ہوگئی۔ اپنے پاس بلا یا نگاہیں ملتے ہی تمام گزشتہ رنجشیں مٹ گئیں محبت پدری نے مرتوالی ہڈیوں میں ایک ولولہ انگیز روح پھونک دی اُٹھکر بیٹے کو سینے سے لگا لیا پیشانی چومی سر پر بوسہ دیا اس کے بعد شمشیر خسروی عنایت کی تاج شاہی اس کے سر پر رکھا اور برسر دربار اپنا ولی عہد مقرر کیا۔

جہانگیر لکھتا ہے "ہم سعادت خدمت و رضا جوئی و حاضر بودن در واقعہ ناگزیر دست

داد و ہم دولت موروثی روزی گشت کہ بعینہ مضمون این غزل بود"

حکیم ابوالفتح گیلانی کا بیٹا حکیم فتح اللہ خسرو کے طرفداروں میں سے تھا۔ جو دن رات اس فکر میں رہتے تھے کہ جہانگیر کو کسی طرح قتل کر کے خسرو کو قید خانہ سے نکال کر اس کی جگہ تخت پر بٹھلائیں۔ قاسم علی نے جس کو جہانگیر نے دیانت خاں کا خطاب دیا تھا اور اس کی خیر خواہی اور وفاداری پر اعتماد رکھتا تھا۔ جہانگیر کو حکیم فتح اللہ کے ارادہ سے مطلع کیا۔ جہانگیر نے حکیم موصوف کو طلب کیا اور پوچھا اس نے قسم کھائی اور کہا کہ میں ہرگز خسرو کا حامی نہیں ہوں مگر اس کے تھوڑے ہی دن بعد اس کا راز کھل گیا اور وہ گرفتار کیا گیا۔

واقعہ یہ ہوا کہ جہانگیر اپنی تخت نشینی کے دوسرے سال کابل سے لاہور کو آرہا تھا۔ راستہ میں مقام سرخاب میں قیام کیا وہاں کسی جاسوس نے اس کو خبر پہنچائی کہ حکیم فتح اللہ نورالدین (پسر غیاث الدین) اور شریف (پسر اعتماد الدولہ) اور بھی کئی ایک اسی قسم کے لوگ پانسو آدمیوں کے ساتھ اس نواح میں اس گھات میں لگے ہوئے ہیں کہ جہاں پناہ کو قتل کر کے خسرو کو تخت نشیں کرائیں۔ یہ سنتے ہی فوراً فوج کا دھاوا ہوا اور باغی گرفتار کیے گئے۔ نورالدین اور شریف وہیں قتل کیے گئے۔ اور فتح اللہ کی بابت یہ حکم ہوا کہ اس کذا کا منہ سیاہ کر کے گدھے پر الٹا سوار کر کے منزل بہ منزل لے چلیں وہاں پہنچکر بادشاہ کے سامنے پیش کیا گیا اس وقت اس نے زمین بوس ہو کر عذر خواہی کی اور کہا کہ لوگوں کے بہکانے سے میں سازش میں شریک ہو گیا تھا ورنہ میں تو دل سے جہاں پناہ کا نمک خواہ اور بندہ درگاہ ہوں۔ جہانگیر کے سامنے اس وقت دیوان حافظ رکھا ہوا تھا۔ اس نے کہا اچھا میں خواجہ سے پوچھتا ہوں اگر تو سچا ہے تو چھوڑ دیا جائے گا حکیم کی خوش قسمتی سے یہ شعر برآمد ہوا ؎

آنکہ پامال جفا کرد چو خاک راہم　　　خاک میبوسم و عذر قدمش نخواہم

جس نے رستہ کی خاک کی طرح ظلم سے مجکو پامال کر ڈالا میں اُسکے قدموں کی خاک چومتا ہوں اور عذر خواہی چاہتا ہوں

من نہ آنم کہ بجور از تو برنجم حاشا　　　چاکر معتقد و بندۂ دولت خواہم

میں وہ نہیں ہوں کہ کبھی تیرے ظلم سے رنجیدہ ہوجاؤں میں وفادار خادم اور خیر خواہ غلام ہوں

آخر وہ رہا کر دیا گیا۔

رانا امر سنگھ والی اُدیپور شاہان مغلیہ کی ماتحتی نہیں قبول کرتا تھا۔ اکبر نے بھی بہت کوشش کی اور اس سے لڑائیاں کرتا رہا لیکن وہ قابو میں نہ آسکا ۱۶۱۳ء میں جہانگیر نے شاہزادۂ بلند اقبال خرّم (بعد میں شاہجہاں) کو رانا کی مہم پر بھیجا اور خود بھی اجمیر میں قیام کیا۔ وہاں زیادہ تر اپنا وقت شکار میں گزارتا تھا اتفاقاً کہیں کلغی کا بیش قیمت الماس گر گیا اس نے اس کو فال بد سمجھا بہت پریشان ہوا اور دیوان حافظ سے تفاؤل کیا یہ شعر نکلا

ستارۂ بدرخشید و ماہ مجلس شد　　　دل رمیدۂ مارا انیس و مونس شد

ایک ستارہ چمکا اور مجلس کا چاند بنگیا میرے پریشان دل کو اس سے سکون اور اطمینان حاصل ہوا

اللہ کی شان دوسرے ہی دن صبح کو وہ الماس ملگیا جس سے دل کو سکون ہوا۔

بعد ازاں یہ فال دیکھی کہ رانا زیر بھی ہوگا یا نہیں جواب ملا۔

کنونکہ در چمن آمد گل از عدم بوجود　　　بنفشہ در قدم او نہاد سر بسجود

اب کہ چمن میں پھول کھلا بنفشہ نے اس کے قدموں پر اپنا سر سجدہ میں رکھا

دو روز کے بعد خبر آئی کہ رانا نے خرّم کی اطاعت قبول کی اور حاضر ہو کر قدمبوس ہوا۔ رانا کی مہم سر کرنے کے بعد شاہزادہ خرم کو دکن کی مہم پر روانہ کیا وہاں اس کو پندرہ مہینہ کا عرصہ لگ گیا۔ جہانگیر کو خرم کے ساتھ بیحد محبت تھی اس طویل مفارقت سے

بیتاب ہوگیا بیٹے کی واپسی کے لیئے دیوان میں فال دیکھی یہ شعر برآمد ہوا۔

چشم بدور کز ان تفرقہ خوش بازآورد　　طالع ناموروو دولت مادرزادت

چشم بددور کہ اس جدائی کے بعد تیرا اچھا طالع اور خاندانی نصیبہ خوشی کے ساتھ تجھکو واپس لایا۔

اس کے چند ہی روز بعد خرم نے دکن سے واپس ہوکر مانڈو کے قلعہ میں جہانگیر کی قدمبوسی حاصل کی جہانگیر نے اس موقع پر ہر چند ضبط کرنا چاہا مگر محبت پدری کے جذبہ نے تمکین و وقار کے پاؤں اکھیڑ دیئے اور بے ساختہ اُٹھکر بیٹے کو سینے سے لپٹا لیا وہ خود اپنی تزک میں لکھتا ہے۔

"بتاریخ یازدہم شوال سن ہزار و بست و شش ہجری بعد از گذشتن سہ پہر و یک گھڑی در قلعہ مانڈو بمبارکی و فرخی سعادت ملازمت دریافت مدت مفارقت پانزدہ ماہ و یازدہ روز کشید بعد از تقدیم آداب کورنش و زمیں بوس بالائے جھروکہ طلبیدم و از غایت محبت و شوق بے اختیار از جائے خود برخاستہ در آغوش عاطفت گرفتم چندانکہ او در آداب و فروتنی مبالغہ نمود من در عنایت و شفقت افزودم و نزدیک حکم نشستن کردم"

صوبہ بنگال میں عثمان افغان نے جو ایک طاقت ور رئیس تھا سر اُٹھا رکھا تھا اکبر نے کئی بار اسکی سرکوبی کے لیئے فوج بھیجی لیکن قابو میں نہ آیا۔ جہانگیر کے تخت نشینی کے ساتویں سال پھر اس نے کچھ شورش کی۔ جہانگیر نے اسلام خاں صوبہ دار بنگال کو حکم بھیجا کہ اس کی اچھی طرح گوشمالی کی جائے۔

اسلام خاں اس وقت ڈھاکہ میں تھا اس نے شجاعت خاں کی سرکردگی میں ایک فوج روانہ کی۔ عثمان نے بھی بڑی بہادری سے مقابلہ کیا اس لڑائی میں بہت سے جہانگیری

امرا کام آئے۔ اثنائے جنگ میں عثمان کی پیشانی پر ایک تیر لگا ہر چند کہ زخم کاری پڑا لیکن اس نے کچھ پروا نہ کی۔ برابر لڑتا رہا اور ساتھیوں کو جوش دلاتا رہا۔ لیکن زخم کی وجہ سے کمزور ہوتا جاتا تھا۔ یہ کیفیت دیکھکر اس کے ساتھی بھی ڈھیلے پڑ گئے اور میدان سے ہٹ گئے آدھی رات کو عثمان اسی زخم سے مر گیا۔ باقی ماندوں نے اطاعت قبول کر لی اور اُن کی جان بخشی ہوئی۔

جہانگیر لکھتا ہے کہ اس مہم کے حکم دینے کے بعد میں نے خواجہ کے دیوان سے تفاؤل کیا تو فال نکلی۔

خوردہ ام تیر نظر بادہ بدہ تا سرمست　　　دست در بند کمر ترکش جوزا فگنم

میں نے تیر نظر کھایا ہے۔ مجھے شراب پلادے تاکہ مست ہو کر میں جوزا کے ترکش کے بند پر ہاتھ ڈالدوں

پنڈت خوشگو اپنے تذکرہ میں لکھتا ہے کہ میرے دادا نے جب بڑھاپے کی وجہ سے ملازمت سے سبکدوشی حاصل کر کے وطن میں رہنا شروع کیا تو ان کا یہ معمول تھا کہ روزانہ دیوان حافظ لیکر دریائے گنگا کے کنارے چلے جاتے اور وہاں فرق شوق کے ساتھ اس کو پڑھتے ایک دن اتفاق سے ادھر سے ایک سادھو گزرا جو ایک پرانی گدڑی پہنے ہوئے تھا اس نے کہا کہ تم یہ کیا پڑھ رہے ہو دوسرے دین کے لوگوں کی کتاب نہیں پڑھنی چاہیئے دادا نے جواب دیا کہ جس شخص کی یہ کتاب ہے وہ بڑے گیانی اور مہاتما پرش تھے۔ اس میں اُنھوں نے بڑی اچھی اچھی باتیں لکھی ہیں۔ سادھو بگڑا اور اُس نے کہا گیانی نہیں خاک تھا یہ کتاب پانی میں پھینکدو دادا کو غصہ آیا اُنھوں نے بگڑ کر کہا کہ تم ایسی باتیں نہ کہو ہم سے تم سے وہ لاکھ درجہ بہتر تھے ان کا ادنیٰ کمال تو یہی ہے کہ جو بات چاہیں ان کی اس کتاب سے پوچھ لیں وہ بتادیتے

ہیں۔ سادہو نے کہا اچھا دیکھو مجھے کیا بتاتے ہیں۔ یہ شعر نکلا۔

بزیر دلق مرقع کمندہا دارند　　　درازدستی این کوتہ آستینان بیں

پیوند لگی ہوئی گدڑی کے نیچے بہت سی کمند رکھتے ہیں ان چھوٹی آستین والونکی درازدستی تو دیکھو

یہ سننا تھا کہ اس نے خواجہ کو فحش گالیاں دینی شروع کیں دادا کو پھر تاب ضبط نہ رہی اُنھوں نے اپنے نوکر کو حکم دیا کہ اس بدزبان کو خوب پیٹو اور ذرا بھی دریغ نہ کرو۔ اس نے پیٹنا شروع کیا مگر گدڑی بہت موٹی تھی چوٹ نہ لگتی تھی آخر اُس نے ارادہ کیا کہ گدڑی اس کے بدن سے کھینچ لے لپک کر کھینچنا تھا کہ نیچے سے آٹھ کمندیں برآمد ہوئیں پھر تو اسکو گرفتار کر لیا۔

مرزا مہدیخاں نادرشاہ کا سوانح نگار لکھتا ہے کہ جب نادر افغانوں کو پسپا کر کے عراق اور فارس پر قبضہ کر چکا تو اس کے ساتھ کے خراسانی لوگ اپنے وطن کو واپس آنا چاہتے تھے۔ اور شاہ طہماسپ اس کو آذربیجان بھیجنا چاہتا تھا نادر متردد تھا کہ کیا کرے۔ خواجہ کی قبر پر گیا اور وہاں جو دیوان رکھا رہتا ہے اس میں فال دیکھی مندرجہ ذیل شعر نکلا۔

عراق و فارس گرفتی بشعر خود حافظ　　　بیا کہ نوبت بغداد و وقت تبریز است

حافظ عراق اور فارس تو اپنے شعروں سے تم نے فتح کر لیا اب بغداد اور تبریز فتح کرنیکا وقت ہے چلو

چنانچہ اسی کے مطابق اس نے حملہ کیا اور ترکوں کے ہاتھ سے تبریز اور بغداد کو چھین لیا۔

غازیپور میں مولوی عبدالصمد صاحب ایک نہایت معزز وکیل اور بہت بڑے رئیس تھے انہیں کے پڑوس میں زنانیہ کے ایک پٹھان رہتے تھے بیچارے

فقر وفاقہ سے بہت تنگ تھے پہلے وہ بستی کے ضلع میں کسی کچہری میں ملازم تھے۔ مگر
کوئی وجہ ہوگئی جس سے وہ نوکری جاتی رہی۔ عیال دار آدمی سخت پریشان تھے کوئی
صورت گزارے کی نظر نہیں آتی تھی۔ ایک دن اپنی مصیبت کے خیال سے بہت تنگدل
تھے کہ یا الٰہی کس طرح کام چلے گا۔ کوئی صورت نظر نہیں آتی دیوان حافظ میں فال دیکھی یہ شعر نکلا

شد لشکر غم بیعدد از بخت میخواہم مدد — تا فخر دین عبدالصمد باشد کہ غمخواری کند

غم کا لشکر بیحد ہوگیا میں اپنے نصیبہ سے مدد چاہتا ہوں ممکن ہے کہ فخر دین عبدالصمد میری غمخواری کریں

گو مولوی عبدالصمد صاحب سخاوت اور شرفا نوازی میں بڑے نیک نام تھے لیکن
یہ پٹھان آدمی اور کبھی کا کوئی تعلق مولوی صاحب موصوف سے تھا نہیں ان کے پاس
جاتے ہوئے ہچکچاتے تھے مگر آخر دل کے تقاضہ سے جانا پڑا انھوں نے جب ان کا حال
سنا تو بہت ترس کھایا اور کوشش کرکے ان کو کچہری میں نوکر رکھا دیا۔

ہمارے ایک دوست مرزا غلام احمد صاحب قادیانی کے ماننے والوں میں سے
تھے۔ اکثر ہمارے پاس آتے ان سے اسی قسم کی مذہبی باتیں رہتیں ایک دن کہنے لگے
کہ دیکھو تو خواجہ حافظ مرزا صاحب کے متعلق کیا کہتے ہیں۔ میں نے کہا آپ ایمان لائے
ہیں اور پھر شک کرتے ہیں۔ کہنے لگے نہیں شک نہیں کرتا۔ بلکہ مجھکو تو فالوں پر کوئی
اعتقاد بھی نہیں ہے۔ یوں ہی کہتا تھا کہ دیکھو میں نے دیوان کھولا خواجہ نے کہا

نیست در دائرہ جز نقطۂ خلاف از کم و بیش — کہ من این مسئلہ بے چون و چرا می بینم

دائرہ میں سوائے نقطہ کے کوئی چیز ذرا بھی خلاف نہیں ہے اور میرے نزدیک یہ مسئلہ بالکل واضح ہے

کہنے لگے کہ میں کچھ نہ سمجھا کہ اس کا کیا مطلب ہے۔ میں نے کہا کہ اس کا یہ مطلب ہے کہ مرزا
صاحب اسی دائرہ میں گردش کرتے ہیں۔ جو اسلام کا ہے۔ قران کو اللہ کی کتاب

مانتے ہیں نبی پر ایمان رکھتے ہیں۔ ان کی حدیثوں پر عمل کرتے ہیں۔ غرض اعتقاد اور عمل ہر لحاظ سے وہ اسلام کے دائرہ سے باہر نہیں نکلتے۔ مگر اس دائرہ میں صرف ایک نقطہ غلط ہے۔ وہ مرزا صاحب کی ذات ہے۔ یعنی جب اسلامی تعلیمات پر وہ چلتے ہیں اور اسی پر چلنے کی لوگوں کو ہدایت کرتے ہیں تو پھر اپنی ذات کو کیوں بیچ میں لاتے ہیں کہ مجھکو مسیح مانو۔ مہدی مانو کرشن مانو یہ خود غرضی ہے اور یہی نقطہ اس دائرے میں غلط ہے ایک مسلمان عالم کی طرح اسلام کی ہدایت لوگوں کو کریں اور اپنی شخصیت کو بیچ میں نہ لائیں تو کچھ قباحت نہیں۔

جنگ روس و جاپان میں جب بحیرہ بالٹک کا بیڑہ جاپان سے لڑنے گیا ہے تو تمام دنیا منتظر تھی کہ دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ مہینوں انتظار میں گزر گئے اور ابھی تک بیڑہ نہیں پہنچا ہمارے ایک دوست نے اس بیڑے کے متعلق فال دیکھی یہ شعر نکلا۔

ز گریہ مردم چشمم نشستہ در خون ست بہ بیں کہ در طلبت حال مردماں چون ست

روتے روتے میری آنکھیں خون میں ڈوب گئی ہیں دیکھو کہ تیری جستجو میں پتلیوں کی کیا حالت ہو گئی ہے

یہ شعر پڑھتے ہی ہمارا پنجابی دوست بے ساختہ پکار اُٹھا "روس دا بیڑا غرک" آخر میں اس کا انجام بھی یہی ہوا۔

فالیں ابھی بہت سی ہیں کہاں تک لکھوں ان کے لکھنے کے لئے ایک دفتر چاہیئے اور طبیعت گھبرا گئی۔ اس لیے اب ختم کرتا ہوں۔